ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور
18 تا 24 اپریل 2002ء

☆ دینی طبقات کے لئے لمحۂ فکریہ (اداریہ)
☆ ذکر الٰہی کی اہمیت و عظمت اور اقسام (منبر و محراب)
☆ فلسطینیوں کا قتل عام اور عالم اسلام کی بے حسی! (تجزیہ)
☆ پیغام اقبال (سال اقبال کے حوالے سے خصوصی تحریر)

اسلامی معاشرے کے زوال کا سبب —— علامہ اقبال کی نگاہ میں

اسلامی معاشرے کے زوال کی وجہ جو علامہ نے بیان فرمائی ہے اس پر بھی غور کرنا مقصود ہے۔ زوال کے جتنے اسباب بیان کئے جاتے ہیں ان کو ایک مرکزی سبب میں مرکوز کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اسلام کے مقصود سے غفلت اور اس کے حصول کے لئے شعوری کوشش کا فقدان۔ اسلامی معاشرہ بالفعل موثر نہیں رہا جب اس نے اپنے منصب (شہادۃ علی الناس) سے گریز کیا' اور اس نے اپنے منصب سے روگردانی تب کی جب اسلام کے اس مقصود کے حصول سے غفلت کی جو دین کی طرف سے عائد ہوتا تھا۔

یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ اسلام کا سیاسی پہلو وسیلہ ہے یا مقصود! قرآن میں اس کی تین جہات ملتی ہیں۔ اولاً یہ کہ انسان کو دنیا میں خدا کے خلیفہ کے طور پر پیدا کیا گیا ہے۔ اس منصب کی تکمیل کے لئے اسلامی ریاست کی تشکیل اور قیام بھی ایک درجے میں مقصود قرار پاتا ہے اور صرف وسیلہ نہیں رہتا۔ دوسری طرف قرآنی اصولوں پر ریاست کا قیام ایک لازمی وسیلہ بنتا ہے۔ ترویج اخلاق و احکام اس وقت تک ناممکن ہوتی ہے جب تک فضائل اخلاق کے حصول کی راہ میں حائل خارجی موانع رفع نہ ہوں۔ اس کے لئے قوت ریاست ضروری ہے۔ نیز اللہ نے خلافت کا وعدہ ایمان اور عمل صالح سے مشروط کیا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ اسلام ایسے افراد کا معاشرہ تشکیل کرنا چاہتا ہے جو روحانیت کے حامل اور فضائل اخلاق کے لئے کوشاں ہوں اور جو' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ میں' اس دنیا میں اللہ کا حکم نافذ کرنا چاہتے ہوں۔ بنابریں' اہل اسلام کی ترقی کا دارومدار اس آدرش کے حصول کی جدوجہد پر ہوگا اور ان کے زوال کا سبب اس سے غفلت قرار دیا جائے گا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مسلم دنیا کا زوال اس چیز کا شاخسانہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو ایک ذاتی شخصی معاملہ بنا کر رکھ دیا اور' علامہ اقبال کے الفاظ میں 'خلافت کو صرف ضرورت اور مصلحت کی چیز بنا لیا۔

(محمد سہیل عمر کی کتاب ''خطباتِ اقبال: نئے تناظر میں'' سے ایک اقتباس)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝﴾ (آیات: ۱۲۴،۱۲۵)

''اور یاد کرو جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے بہت سی بڑی بڑی باتوں میں' پس وہ اُن سب میں پورے اُترے۔ (اس پر اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: اے ابراہیم! میں تمہیں تمام نوعِ انسانی کا امام بنانے والا ہوں۔ (حضرت ابراہیم نے) کہا: اور میری اولاد میں سے؟ (اللہ نے) فرمایا' تمہاری اولاد میں جو ظالم ہوں گے' میرا یہ عہد ان سے متعلق نہیں ہوگا۔ اور یاد کرو جب ہم نے (اپنے) گھر کو لوگوں کے لئے زیارت گاہ بنا دیا اور امن کی جگہ۔ اور (پھر حکم دیا) اب تم مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو۔ اور ہم نے عہد لیا تھا ابراہیم اور اسماعیل سے کہ میرے گھر کو پاک رکھو طواف کرنے والوں کے لئے اور اعتکاف کرنے والوں کے لئے اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے۔''

ماقبل کے دس رکوعوں میں خطاب کا اصل رخ بنی اسرائیل کی جانب تھا جس میں انہیں بتایا گیا کہ تم پر اللہ نے بے انتہا انعامات کئے اور تمہیں جہان والوں پر فضیلت عطا کئے رکھی لیکن تم نے صحیح روش اختیار نہ کی۔ یہ تمہارے جرائم کی فردِ قرارداد ہے' پس اسی کج روی کی وجہ سے اب تمہیں معزول کیا جارہا ہے۔ اس معزولی کی علامت کے طور پر دو رکوعوں کے بعد تحویلِ قبلہ کا حکم آنے والا ہے۔ زیرِ نظر آیات میں بطور تمہید حضرت ابراہیمؑ اور بیت اللہ کی عظمت کا ذکر ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت بنی اسرائیل اور بنو اسماعیل دونوں کے لئے نہایت قابلِ احترام تھی کہ دونوں کا سلسلہ نسب انہی کی ذات پر جاکر ملتا تھا۔ بنی اسرائیل کے جدِ امجد حضرت یعقوبؑ' حضرت ابراہیم کے پوتے ہیں جبکہ بنو اسماعیل کے جدِ امجد حضرت اسماعیلؑ' حضرت ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے ہیں۔ پس حضرت ابراہیم کی ذات دونوں گروہوں کے لئے قدرِ مشترک ہے۔ لہٰذا اب ذکر شروع ہوا حضرت ابراہیم کا اور تعمیرِ کعبہ کا۔ حضرت ابراہیم کو رب تعالیٰ نے کئی آزمائشوں سے گزارا جن میں سب سے بڑی آزمائش تیرہ سال کے اکلوتے بیٹے کی قربانی کا حکم تھا۔ ان سب امتحانوں میں حضرت ابراہیم کامیاب ہوئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہیں تمام نوعِ انسانی کا امام بنانے والا ہوں۔ تب آپ نے برجستہ سوال کیا' اور میری اولاد میں سے؟ یعنی یہ وعدہ تنہا مجھ ہی سے ہے یا میری اولاد سے بھی ہے۔ اللہ نے فرمایا: دیکھو! تمہاری اولاد میں سے جو ظالم ہوں گے یعنی غلط راہ پر چلیں گے ان کے ساتھ میرا یہ وعدہ نہیں ہوگا۔ البتہ تمہاری اولاد میں سے جو راست رو ہوں گے یعنی توحید و رسالت اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوئے تمہاری راہ پر چلیں گے ان کے ساتھ میرا وعدہ ہوگا اور انہیں بھی نوعِ انسانی کی امامت کا منصب عطا ہوگا۔ پھر فرمایا' اور یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے زیارت گاہ بنا دیا کہ لوگ یہاں حج اور عمرہ کے لئے کھنچے چلے آتے ہیں۔ اور امن کی جگہ بنا دیا کہ اپنے باپ کا قاتل بھی اگر حرم شریف میں نظر آجائے تو اُسے کچھ نہیں کہا جاتا۔ پس اس جگہ کو نماز کی جگہ بنالو' یعنی وہ جگہ جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ بیت اللہ کی دیواریں بلند کر رہے تھے۔ یہ پتھر تھا جو ضرورت کے مطابق خود بخود ہی اونچا ہوتا جاتا تھا۔ وہ پتھر اب بھی موجود ہے۔ ہر طواف کے بعد یہاں دو رکعت نفل ادا کئے جاتے ہیں۔ بیت اللہ کی عظمت کے اظہار کے طور پر فرمایا کہ پھر ہم نے ابراہیم اور اسماعیل دونوں کو حکم دیا کہ بیت اللہ کو ظاہری نجاست سے بھی صاف ستھرا رکھو اور باطنی نجاست یعنی شرک سے بھی پاک رکھنا' تاکہ یہاں طواف' اعتکاف اور رکوع و سجود کی غرض سے آنے والوں کو سہولت رہے اور انہیں عبادت کے لئے صاف ستھرا اور سازگار ماحول میسر آئے۔ اب بھی حرم پاک کو خوب صاف ستھرا رکھا جاتا ہے۔ گویا یہ ابراہیم اور اسماعیل سے لئے گئے عہد ہی کی پابندی ہو رہی ہے۔

☆ ☆ ☆

فرمانِ نبوی — چوہدری رحمت اللہ بٹر

مشتبہات سے بچنے کی ہدایت

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((اِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَاِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَاَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ وَمَنْ وَقَعَ فِى الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِى الْحَرَامِ كَالرَّاعِىْ يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ اَنْ يَرْتَعَ فِيْهِ اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى اَلَا وَاِنَّ حِمَى اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ اَلَا وَاِنَّ فِى الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِىَ الْقَلْبُ)) (رواہ مسلم)

''حضرت نعمان بن بشیرؓ راوی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جو حلال ہے وہ واضح اور روشن ہے اور جو حرام ہے وہ بھی واضح اور روشن ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ چیزیں ہیں جو مشتبہ ہیں۔ ان کو (یعنی ان کے شرعی حکم کو) بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ پس جو لوگ شبہ والی چیزوں سے بھی (از راہِ احتیاط) پرہیز کرلیں گے وہ اپنے دین اور آبرو کو بچالیں گے۔ اور جو شخص شبہ والی چیزوں میں ملوث ہو گیا وہ حرام تک پہنچ جائے گا' اس چرواہے کی طرح جو اپنے جانور سرکاری طور پر محفوظ کی گئی چراگاہ کے قریب لے جاتا ہے۔ قریب ہے کہ اس کے جانور اس چراگاہ میں داخل ہو جائیں۔ جان لو کہ ہر بادشاہ کے لئے ایک مخصوص سرکاری چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی وہ چراگاہ' حرام کردہ اشیاء ہیں۔ اور جان لو' جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے کہ اگر وہ ٹھیک ہو تو سارا جسم ٹھیک ہوتا ہے اور اگر اس میں فساد (مالک کی حرام کی ہوئی چیزوں میں ملوث ہونے کا داعیہ) پیدا ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ آگاہ رہو کہ گوشت کا وہ ٹکڑا دل ہے۔''

حرام سے بچنے کے لئے مشتبہ چیزوں سے بچنا ہی عقلمندی ہے اور یہی تقویٰ کی روش ہے۔ اگر کسی کے دل میں یہ چیز پیدا ہو جائے تو اس کے لئے حرام سے بچنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر دل تقویٰ سے خالی ہو تو حیوانی خواہشات و شہوات غالب ہو جاتی ہیں کہ انسان پھر ان خواہشات کا بندہ بن جاتا ہے اور مشتبہات میں ملوث تو ہوتا ہی ہے' محرمات کا بھی عادی ہو جاتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ دل کو اللہ کی یاد سے منور رکھا جائے اور ذکرِ الٰہی یعنی قرآن مجید کو دل کی بہار بنالیا جائے تاکہ محرمات کی طرف رغبت پیدا نہ ہونے پائے۔ (آمین)

اداریہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حافظ عاکف سعید

دینی طبقات کے لئے لمحہ فکریہ

گزشتہ شمارے میں ادارتی تحریر کے اختتام پر ہم نے اس صورت حال پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہ قوم کی ایک عظیم اکثریت سیکولر سوچ کی حامل ہے یہ عرض کیا تھا کہ: ''یہ صورت حال ملک میں اسلام کے نام لیوا طبقات اور دینی جماعتوں کے لئے ایک بڑے لمحہ فکریہ سے کم نہیں! —— آئندہ شمارے میں اسی پر گفتگو ہوگی۔'' سو آج ہمیں اسی حوالے سے اظہار خیال کرنا ہے۔

آگے بڑھنے سے قبل مناسب ہوگا کہ اس بات کا تعین کر لیا جائے کہ جب ہم سیکولر سوچ' سیکولر طرز فکر یا سیکولر طرز حکومت کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد کیا ہے! —— گزشتہ دو صدیوں کے دوران مغرب میں جو سیکولر سوچ پروان چڑھی ہے اور جو آج کم وبیش پوری دنیا پر مسلط ہے' ہمارے نزدیک اس کا حاصل یہ ہے کہ مذہب ہر انسان کا پرائیویٹ معاملہ ہے' اجتماعی معاملات اور نظام حکومت کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے' بلکہ تمام اجتماعی اور ملکی معاملات مثلاً نظام سیاست' نظام معیشت اور نظام معاشرت کے اصول وقوانین کو خالص دنیاوی انداز میں افرادِ قوم کی باہم مشاورت اور کثرت رائے کے اصول پر طے کیا جانا چاہئے۔ سیکولرازم کے نقطہ نگاہ سے اِن تمام اجتماعی معاملات میں مذہب کا عمل دخل خالص دقیانوسیت کا مظہر شمار ہوتا ہے جس کی آج کی ''مہذب دنیا'' میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مذہب کا دائرہ کار محض گھر کی چار دیواری یا عبادت گاہوں تک محدود سمجھا جاتا ہے۔ سیکولر طرز حکومت میں ایک ملک میں رہنے والے تمام شہری خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے کیوں نہ ہو اور خواہ ایک ملک میں بیسیوں مذاہب کے پیروکار رہتے ہوں' ہر اعتبار سے برابر کے شہری شمار ہوتے ہیں اور مکمل طور پر برابر کے حقوق رکھتے ہیں۔ یہ وہ ''تابناک نظریہ'' ہے جس کی آج پوری دنیا میں پرستش ہو رہی ہے۔

یہ سوچ موجودہ عیسائی مذہب کے ساتھ اس پہلو سے ہم آہنگی رکھتی ہے کہ موجودہ عیسائیت میں' جسے پال ازم کہنا زیادہ مناسب ہوگا' سرے سے کوئی اجتماعی نظام موجود نہیں ہے۔ وہاں مذہب (Religion) فی الواقع انسان کا ایک پرائیویٹ معاملہ ہے —— جبکہ اسلام مذہب نہیں' دین ہے۔ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے' جو انسان کے محض انفرادی اور پرائیویٹ ہی نہیں' تمام اجتماعی معاملات کا بھی پوری طرح احاطہ کرتا ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی شعبہ اس کے حیطۂ اثر سے باہر نہیں۔ اسلام کا اپنا ایک مکمل نظام معاشرت ہے جو آج دنیا میں رائج طرز معاشرت سے یکسر مختلف ہے۔ اسلام کے اپنے اقتصادی اصول ہیں جو آج کی دنیا کے مروجہ اقتصادی نظام کے لئے موت کا درجہ رکھتے ہیں کہ آج پوری دنیا کی معیشت میں اُس سودی لین دین کو مرکز ومحور کا مقام حاصل ہے جو اسلام کی رو سے مبغوض ترین اور ملعون ترین برائی شمار ہوتا ہے۔ اسلام کے اپنے سیاسی اصول ہیں جو سیکولر طرز حکومت سے بالکل جدا اور مختلف ہیں۔ اسلام کی رو سے حاکمیت کا حق صرف خالق ومالکِ ارض وسماوات کو حاصل ہے۔ جو قوانین اس ذات باریٔ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں وہ اٹل ہیں' ان میں کسی صورت ترمیم نہیں کی جاسکتی۔ بقول اقبال ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی' باقی بتانِ آزری!

جبکہ سیکولر طرز حکومت میں یہ اختیار انسانوں کو تفویض کیا گیا ہے کہ وہ حکومت کرنے اور ہر نوع کی قانون سازی کا مکمل حق رکھتے ہیں۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کی مطلق بالادستی کو تسلیم کیا جائے' خواہ اس کے لئے پوری دنیا ہی سے ٹکر لینی پڑے جبکہ سیکولرازم کی تعلیم یہ ہے کہ ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی''۔ اب بتایئے کہ بھلا اسلام اور سیکولرازم میں مطابقت پذیری کا کہیں کوئی امکان ہوسکتا ہے۔ ناممکن!!

یہ امر واقعہ بھی ہے اور ہمارے لئے ایک بہت بڑا لمحہ فکریہ بھی کہ مسلمانان پاکستان کی ایک عظیم اکثریت آج سیکولر سوچ کی حامل ہے۔ اگرچہ صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف نے ریفرنڈم کی تیاری کی خاطر عوامی سیاست کے میدان میں کودنے کے بعد یہ ''خالص سیاسی بیان'' دینا ضروری سمجھا کہ ''میں سیکولر نہیں ہوں''۔ اللہ کرے کہ وہ سیکولر نظریات سے واقعی تائب ہو جائیں اور اس مملکت خداداد پاکستان میں حقیقی اسلامی نظام کے قیام کے لئے سرگرم عمل ہو جائیں۔ —— لیکن تادم تحریر ان کی ہر ادا' ہر عمل' ہر بڑے اقدام اور ہر پالیسی بیان سے یہ بات بدیہی طور پر عیاں ہے کہ وہ سیکولر سوچ کے حامل ہی نہیں' علمبردار بھی ہیں —— چنانچہ صدر صاحب کے اس سیاسی بیان سے قطع نظر امر واقعہ یہی ہے کہ ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے اور ہائر بیوروکریسی میں شامل افراد کی بھاری اکثریت خواہ ان کا تعلق سول سے ہو یا آرمی سے' نہ صرف یہ کہ خالص سیکولر طرز زندگی اپنائے ہوئے ہیں بلکہ کھلم کھلا سیکولر خیالات کا اظہار کرنے میں بھی باک محسوس نہیں کرتے۔

ہمارے بعض مذہبی سیاسی قائدین کا یہ خیال ہے کہ سیکولر سوچ رکھنے والا طبقہ ہمارے ملک میں آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ ان کے خیال میں یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم پر گزشتہ ۵۰ برسوں سے سیکولر نظریات کے حامل حکمران مسلط رہے' ورنہ ہمارے عوام کی عظیم اکثریت (جو ان کے خیال میں ۹۰ فیصد سے زائد ہے) سچے اسلامی نظریئے کی حامل ہے۔ حالانکہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقات اور ہائر بیوروکریسی کی عظیم اکثریت کی مانند عوام الناس کی ایک غالب اکثریت پر بھی خالص مادہ پرستانہ اور سیکولر خیالات کی چھاپ نظر آتی ہے' جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ملکی انتخابات میں ہمارے ''غریب عوام'' اور عام شہریوں کے ووٹوں کا زیادہ وزن ہمیشہ سیکولر سیاسی جماعتوں کے پلڑے میں پڑتا رہا ہے' جس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ عوام کے نزدیک بھی ملکی واجتماعی معاملات کے حل اور نظام حکومت کو چلانے کے لئے آج سیکولر ذہن رکھنے والے حکمرانوں کی ضرورت ہے' حقیقی دینی فکر رکھنے والے قائدین کی نہیں۔

ہم اپنے ان دینی قائدین کی خدمت میں جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں سیکولر طبقہ صرف آٹے میں نمک کے برابر ہے' بصد ادب عرض کریں گے کہ اگر انہیں ہماری اس بات سے اتفاق نہیں ہے تو وہ ان فرمودات نبویؐ ہی کو ضرور پیش نظر رکھیں جن میں رسالت مآب ﷺ نے اس ضمن میں بڑی روشن اور واضح اصولی رہنمائی امت کو دی ہے: ''کما تکونون کذالک یومر علیکم'' جیسے تم (عوام) ہوگے اسی طرح کے حکمران تم پر مسلط کر دیئے جائیں گے۔ اسی طرح فرمایا: ''اعمالکم عمالکم'' کہ تمہارے اپنے اعمال ہی تم پر عامل (حاکم) بن کر مسلط ہو جاتے ہیں —— یہ آنحضور ﷺ کا عطا کردہ رہنما اصول ہے جو مسلمانوں کے معاملے میں تو صد فی صد منطبق ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ سیکولر سوچ کا حامل طبقہ ملکی آبادی کا چند فیصد ہے' حقائق کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔

اس تناظر میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہماری دینی جماعتیں گزشتہ پچاس برسوں میں اس ملک میں اپنا رول ادا کرنے میں بری طرح ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ ہمارے دینی سیاسی قائدین اور دینی جماعتوں نے اپنی جدوجہد کی بنیاد جس اہم نکتے کو بنایا وہ بجائے خود غلط تھا۔ ہماری دینی سیاسی جماعتیں عوام کو سچا پکا مسلمان اور مظلوم ومقہور قرار دے کر ہمیشہ پنجے جھاڑ کر حکمران طبقے کے پیچھے پڑی رہیں' حالانکہ جتنے کچھ سیکولر ہمارے حکمران ہیں' کم وبیش اسی قدر سیکولر یہاں کے عوام بھی ہیں۔ تشخیص چونکہ غلط تھی لہٰذا علاج بھی غلط نہج پر کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ اس ملک میں اسلام آسکا اور نہ ہی دینی سیاسی جماعتوں کے ہاتھ اسلام آباد آیا! —— آئندہ ہمیں اس نکتے پر گفتگو کرنا ہے کہ دینی جماعتوں اور علماء کرام کے کرنے کا اصل کام کیا ہے! ان شاء اللہ

ہفت روزہ ندائے خلافت لاہور — پبلشر: اسعد احمد مختار — طابع: رشید احمد چوہدری — بانی: اقتدار احمد مرحوم
سی پی ایل نمبر: 127۔ جلد 11' شمارہ 15 — مطبع: مکتبہ جدید پریس۔ ریلوے روڈ' لاہور — مدیر: حافظ عاکف سعید
سالانہ زر تعاون: 250 روپے' قیمت: 5 روپے — مقام اشاعت: 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-5869501 — نائب مدیر: فرقان دانش خان

ذکر کا مقصد انسانی روح میں پوشیدہ اللہ کی یاد کو جگانا ہے

قرآن ہمہ تن ذکر ہے اس لئے ذکر کا اعلیٰ ترین ذریعہ ہے

ذرائع ذکر کو ''ذکر'' سمجھنا بہت بڑا مغالطہ ہے جس کی تصحیح ضروری ہے

ذرائع ذکر میں اولاً قرآن' دوم نماز' سوم ادعیہ ماثورہ اور چوتھے نمبر پر مسنون اوراد شامل ہیں

نماز اللہ کے ذکر کی جامع ترین صورت ہے' نماز میں قولی اور عملی ذکر کی دونوں صورتیں یکجا ہو جاتی ہیں

رسول اکرم ﷺ کے راستے سے ہٹ کر چلنے والا کتنا ہی مخلص کیوں نہ ہو منزل تک نہیں پہنچے گا

مسجد دارالسلام باغ جناح' لاہور میں امیر تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد کے ۱۲ / اپریل ۲۰۰۲ء کے خطاب جمعہ کی تلخیص

میں گزشتہ چار اجتماعاتِ جمعہ میں اپنی علالت کے باعث غیر حاضر رہا۔ اس سے پہلے ان اجتماعات میں ''حقیقتِ ایمان'' پر بحث چل رہی تھی۔ ایک خطابِ جمعہ میں ایمان کی ضد یعنی قانونی اور ظاہری سطح پر کفر ــــ اور باطنی اور داخلی سطح پر نفاق کے حوالے سے گفتگو ہوئی تھی۔ اس ضمن میں پوری سورۃ المنافقون بھی بیان ہوئی تھی۔ میری علالت سے پہلے والے خطابِ جمعہ میں موضوع تھا کہ نفاق کا علاج کیا ہے! میں نے عرض کیا تھا کہ نفاق سے بچنے کی احتیاطی تدبیر ''دوامِ ذکر'' ہے' جیسا کہ سورۃ المنافقون میں فرمایا گیا:

''اے اہل ایمان' تمہیں تمہارے اموال اور اولاد اللہ کے ذکر سے غافل نہ کرنے پائیں!''

نفاق سے بچنے کی صورت صرف یہی ہے کہ دل میں ہر وقت اللہ کی یاد موجود رہے۔ آج ذکر کے حوالے سے ہمیں سمجھنا ہے کہ ذکر اصل میں کہتے کسے ہیں۔ عربی زبان میں ذکر کی تعریف ہے: ''استحضار اللّٰہ فی القلب'' دل میں اللہ کو حاضر کر لینا۔ اللہ کی یاد ہر انسان کی روح میں موجود ہے۔ عام حالات میں یہ خوابیدہ (Dormant) رہتی ہے کیونکہ ہماری توجہ دنیا کی طرف ہے' دنیا کے مسائل کی طرف ہے' کہیں بیماریاں ہیں' کہیں بچوں کے داخلوں کا مسئلہ ہے۔ ہم انہی میں مگن ہیں' لہٰذا روح اور اس کے تقاضوں کی طرف ہماری توجہ ہی نہیں۔ توجہ کو اُدھر مبذول کرنا اور اس روح میں پوشیدہ اللہ کی یاد کو گہرائیوں سے ابھار کر شعور کی سطح پر لے آنا' درحقیقت اس عمل کا نام ذکر ہے۔ قرآن کے جملوں کو آیت یعنی نشانی اسی لئے کہا جاتا ہے کہ نشانی کے ذریعے سے کوئی شے یاد آتی ہے۔ آپ کوئی شے بھول گئے تھے' اس کی نشانی آپ کے سامنے آئی تو اب وہ چیز یاد آ جائے گی۔ اسی طریقے سے انسان اللہ کو بھول جاتا ہے' اس کی توجہ اللہ کی طرف سے ہٹی ہوتی ہے تو ان آیات کے ذریعے سے توجہ کو اللہ کی طرف مبذول کرانا اور یاد دہانی مقصود ہے۔ تو یہ ہے اصل میں ذکر۔ اب آیئے دیکھیں کہ ذکر کی عظمت کیا ہے! سورۃ الرعد میں فرمایا:

﴿اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ﴾

''اللہ کے ذکر میں دلوں کا سکون اور اطمینان پوشیدہ ہے۔''

اس دنیا میں رہتے ہوئے انسان کو جو پریشانیاں اور طرح طرح کے مسائل پیش آتے ہیں اور ان کی وجہ سے جو کوفت اور صدمہ پہنچتا ہے' ان سب مصائب و آلام سے سکون کے ساتھ گزر جانا' یہ ذکر کی سب سے بڑی خصوصیت یا عظمت ہے۔ مختصراً یہ کہ ہمارے سوئے ہوئے دل اور خوابیدہ روح کو جگا دینا' یہ ذکر کا مقصد ہے۔ جب یہ مقصد حاصل ہو گیا تو پھر اطمینان ہی اطمینان' امن ہی امن ہے۔ ایمان کا لفظ بنا ہی ''امن'' سے ہے۔ امن اسے کہتے ہیں:

﴿وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ﴾

''نہ انہیں کوئی خوف ہو گا نہ حزن وملال''

حزن یا ملال کسی نقصان پر ہوتا ہے کہ یہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اگر آدمی کو ایمان حاصل ہو گا تو اس کی کیفیت یہ ہو گی کہ اللہ کی مرضی تھی' ہو گیا۔ لہٰذا وہ پریشان نہیں ہو گا۔ امن وسکون کی یہ کیفیت ذکر کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ کیسی ہی مشکلات ہوں' مصائب ہوں' لیکن دل آپ کا جما ہوا ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے' باہر ہو رہا ہے لیکن اندر سے آپ پُرسکون ہوں' چٹان کی مانند ہوں تو اب کوئی ہوا اور آندھی آپ کو ہلا نہیں سکتی۔ اس امن وسکون سے بڑی کوئی دولت نہیں ہو سکتی۔

اب آیئے ایک اہم نکتے کی طرف کہ ذکر کے ذرائع کون کون سے ہیں اور ان میں اہمیت کے اعتبار سے ترتیب کیا ہے! واضح رہے کہ جن چیزوں کو عام طور پر ہم ذکر کہتے ہیں وہ دراصل ذکر کے ذرائع ہیں۔ ذکر تو اس کیفیت کا نام ہے کہ اللہ کی یاد دل میں تازہ رہے۔

اہم ترین ذریعۂ ذکر ''القرآن'' ہے' اس لئے کہ قرآن مجید خود کو ''الذکر'' کہتا ہے۔ قرآن حکیم سے بڑا ذکر اور کوئی نہیں۔ تلاوت قرآن بشرطیکہ سمجھ کے ساتھ ہو' ترتیل کے ساتھ ہو اور اس پر غور ہو رہا ہو' ذکر کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ یہ نہ ہو کہ آپ فرنٹیئر میل کی رفتار سے پڑھتے چلے جا رہے ہوں' اگرچہ اس کا ثواب تو ملے گا کہ آپ نے قرآن کو پڑھنے میں کچھ وقت لگایا ہے' لیکن یہ ذکر نہیں ہو گا اور اس سے وہ مطلوبہ مقصد حاصل نہیں ہو گا۔ قرآن سب سے اعلیٰ ذکر کیوں ہے' اس میں غیر معمولی تاثیر کیوں ہے؟ اصل میں قرآن اور ہماری روح کا منبع ایک ہے۔ قرآن ذات باری تعالیٰ سے وارد ہوا ہے۔ اور روح انسانی کا بھی اللہ کی ذات کے ساتھ بلاواسطہ ایک تعلق ہے۔ جیسے یہ سورج کی کرنیں ہم تک پہنچتی ہیں تو سورج سے کروڑوں میل دور ہو کر بھی ان کا اس سے تعلق منقطع نہیں ہوتا۔ ہماری اس خوابیدہ روح پر جب کلام اللہ کی پھوار پڑتی ہے' یا یوں کہئے کہ قرآن کی بانسری کی آواز اس کے کانوں میں جب پڑتی ہے تو یہ اپنے دوست کی آواز پہچان لیتی ہے۔ گویا قرآن اور روح آپس میں ''گرائیں'' ہیں' ایک ہی جگہ سے آئے ہیں۔ جیسے آپ کسی اجنبی ملک میں ہوں اور آپ کو کوئی پاکستانی مل جائے تو اس سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔ درحقیقت اسی طرح یہ روح' قرآن کی آواز سے بیدار ہوتی ہے اور اس میں ایک انبساط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ سب سے بڑا ذریعۂ ذکر ''تلاوت قرآن'' ہے۔

قرآن کے بعد دوسرے نمبر پر اہم ترین ذریعۂ ذکر نماز ہے لیکن نوٹ کرنے کی بات ہے کہ نماز کا بھی جزوِ اعظم قرآن ہی ہے۔ نماز کی ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ ہے' پھر دوران نماز آپ قرآن کا کچھ حصہ تلاوت بھی کرتے ہیں۔ نماز اس اعتبار سے جامع ترین ذکر ہے کہ اس میں ذکرِ لسانی کے ساتھ ساتھ ذکرِ عملی بھی ہے۔ آپ نے کہا ''اللہ اکبر'' اور رکوع کے لئے جھک گئے۔ یہ جھک جانا' گویا کہ اللہ اکبر کی تعمیل ہے۔ اللہ بڑا ہے تو اس کے سامنے جھک جانا چاہئے۔ پھر ''اللہ اکبر'' کہا اور سجدے میں چلے گئے۔ سجدے میں گویا پیشانی اللہ کے قدموں میں رکھ دی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بندہ اللہ سے قریب ترین سجدے کی حالت میں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے اور اللہ کے درمیان ہماری انا حائل ہے۔ میں' میری خواہش' میرا فیصلہ' میری سوچ' میرا فلسفہ' لیکن جب آپ نے سجدے میں سر رکھ دیا تو اب آپ کے پاس کیا رہ گیا! ''میں'' تو ختم ہو گئی۔ بہرحال نماز میں عملی ذکر بھی ساتھ ہو رہا ہے۔ نماز کے بارے میں فرمانِ رسالت ہے:

((اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ))

''نماز مؤمن کی معراج ہے۔''

جیسے معراج میں حضور ﷺ کا اللہ کے ساتھ مخاطبہ ہوا تھا' ایسے ہی نماز میں ہمارا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مکالمہ ہوتا ہے۔ قرآن کے بعد نماز اللہ کے ذکر کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اسی لئے قرآن میں فرمایا گیا:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ﴾

''نماز قائم کرو میری یاد کے لئے۔''

اب یہ نوٹ کیجئے کہ نماز فی نفسہٖ ذکر نہیں ہے' ذکر کا ذریعہ ہے۔ ہمارا مغالطہ یہ ہے کہ ہم نے ذرائع ذکر کو ''ذکر'' سمجھ لیا ہے۔ قرآن اور نماز بھی اللہ کے ذکر کے ذرائع ہیں۔ قرآن ہمہ تن ذکر ہے اس لئے ذکر کا اعلیٰ ترین ذریعہ ہے۔ اس کے بعد ذکر کا سب سے بڑا ذریعہ نماز ہے۔ نماز میں عمل اور قول دونوں شامل ہو جاتے ہیں۔

تیسرے درجے پر ذکر کا ذریعہ ادعیہ ماثورہ ہیں۔ انسان شب و روز میں جو بھی کام کرتا ہے اس کے لئے ایک مسنون دعا سکھائی گئی ہے اور یہ وہ چیز ہے جس سے ''دوام ذکر'' حاصل ہوتا ہے' جس کے لئے سورۂ آل عمران میں فرمایا کہ: ''وہ (اہلِ ایمان) اللہ کو یاد رکھتے ہیں' کھڑے ہوئے بھی' بیٹھے ہوئے بھی' لیٹے ہوئے بھی''۔

اب تین ہی حالتیں ہیں' چوتھی حالت تو کوئی نہیں۔ آپ یا کھڑے ہیں یا بیٹھے ہیں یا لیٹے ہیں' مقصود یہ ہے کہ ہر حالت میں اللہ یاد رہے۔ یہ کیسے ہو گا؟ اس کا سب سے بڑا ذریعہ یہی دعائیں ہیں۔ قرآن اور نماز تو ذکر کے بڑے بڑے ذرائع ہیں لیکن ظاہر بات ہے کہ تلاوتِ قرآن ۲۴ گھنٹے تو آپ نہیں کر سکتے۔ نماز ۲۴ گھنٹے تو نہیں ہوتی لیکن ایک عمل چوبیس گھنٹے کا ہے اور وہ یہ دعائیں ہیں۔ سونے لگے ہیں تو دعا ہے' جاگے ہیں تو دعا ہے' بیت الخلاء میں جا رہے ہیں تو دعا ہے' بیت الخلاء سے باہر نکلے ہیں تو دعا ہے' وضو کے لئے بیٹھے ہیں تو دعا ہے' گھر سے مسجد کے لئے نکلے ہیں تو دعا ہے' مسجد میں داخل ہو رہے ہیں تو دعا ہے' پھر نماز پڑھ رہے ہیں تو یہ اہم ذکر ہے' اس کے بعد وہاں سے نکلنے کی دعا ہے' بازار میں داخل ہوں تو دعا ہے' آئینہ دیکھیں تو دعا ہے' کپڑے بدلیں تو دعا ہے۔ دنیا کا کوئی کام حتیٰ کہ بیوی سے ہمبستری کریں تو دعا ہے' اس لئے فرمایا کہ اگر تم اس وقت دعا نہیں مانگتے تو ہو سکتا ہے کہ شیطان اس عمل میں تمہارا شریک ہو جائے۔ ان دعاؤں کے مانگنے میں کوئی اضافی وقت بھی نہیں لگتا' کام میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی۔ جیسا کہ پنجابی میں کہتے ہیں کہ ''ہتھ کار وَل' دل یار وَل'' (یعنی ہاتھ کام کی طرف' دل یار کی طرف) اس میں بھی یہی ہے کہ آدمی کام بھی کر رہا ہے اور دعا بھی کر رہا ہے۔ یہ دوام ذکر ہے۔ مزید برآں اس کے اندر دو برکتیں اور دو خیر مضمر ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ سے دعا ہو رہی ہے گویا یہ تعلق مع اللہ کا ذریعہ ہے۔ دوسرے یہ کہ دعا کے الفاظ مسنون ہیں اور آنحضور ﷺ کے تلقین کردہ ہیں۔ اس طرح بیک وقت دو نسبتیں آپ کو مل گئیں۔ بہرحال ادعیہ ماثورہ ذرائع ذکر میں تیسرے نمبر پر ہیں۔ ان کا اہتمام ہونا چاہئے۔ صرف ایک مشقت ضرور ہے کہ یہ دعائیں یاد کرنا پڑتی ہیں اور اگر یاد کر کے انسان ان کا عادی ہو جائے تو پھر کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

چوتھے نمبر پر مختلف اوراد ہیں' کسی چیز کو گن کر ورد کرنا۔ ان میں بھی جو مسنون اوراد ہیں ان کی بڑی اہمیت ہے' مثلاً تسبیح فاطمی مسنون ہے' جس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر نماز کے بعد اس کا اہتمام کیا جائے۔ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر فرض نماز کے بعد دعا کیا کرو:

((اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ))

مختصر یہ کہ مسنون اوراد بھی ذکر کا بہترین ذریعہ ہیں۔ کچھ اوراد ایسے بھی ہیں جو بزرگانِ دین نے مختلف افراد کو ان کی شخصی و انفرادی کیفیات کے حوالے سے بطور علاج تجویز کئے ہوتے ہیں۔ جیسے جسمانی معالج کو مرض کی تشخیص کرنا پڑتی ہے کہ مریض کا جگر خراب ہے یا گردے کی خرابی ہے' اسی طرح معالجینِ روحانی جو لوگوں کو رشد و ہدایت کا رستہ بتاتے ہیں' وہ ایک ماہر نفسیات دان کی طرح کسی شخص کی اصل بیماری کی تشخیص کر کے اسے ذکر تجویز کرتے ہیں۔ مثلاً کسی شخص میں حب دولت زیادہ ہے یا بخل ہے تو وہ اس کے حوالے سے کوئی مؤثر آیت بتائیں گے کہ تم یہ آیت اتنی مرتبہ پڑھا کرو' اس کا مراقبہ کیا کرو۔ مراقبہ یہ ہے کہ ہر طرف سے یکسو ہو کر ایک ہی آیت کو دہراتے رہو۔ اس خاص آیت سے تمہارے اس مرض کا علاج ہو جائے گا۔ اس طریقے سے مختلف لوگوں کے لئے کوئی ذکر اگر کوئی اللہ والا تجویز کرتا ہے تو وہ بھی مفید ہے۔ لیکن یہ ذریعہ ذکر پانچویں نمبر پر ہے۔ ہمارے ہاں غلطی یہ ہوئی کہ صرف اسی کو اصل ذکر سمجھ لیا گیا کہ یہ ذکر نقشبندی ہے' ان کا یہ طریقہ ہے۔ یہ قادریوں کا ذکر ہے یا یہ ذکر لسانی ہے' یہ ذکر قلب سے ہے۔ یہ چیزیں اپنی جگہ پر درست ہوں گی لیکن انہیں پانچویں نمبر پر رکھیں۔ ہم نے چونکہ انہیں اولیت دے دی تو معاملہ تلپٹ ہو گیا۔ لہٰذا یاد رکھئے اولاً قرآن' ثانیاً نماز' ثالثاً ادعیہ ماثورہ اور پھر اوراد' اور ان اوراد میں بھی مسنون اوراد پہلے ہیں۔ اگر اس معاملے میں ترتیب کو بدل دیا جائے یا نسبت تناسب میں عدم اعتدال کی کیفیت ہو جائے تو پھر یوں سمجھئے کہ معاملہ وہ ہو جائے گا کہ ''خلاف پیمبر کسے رہ گزید' کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید'' یعنی جو کوئی بھی پیغمبر کے راستے سے ہٹ کر چلے گا تو چاہے کتنا بھی مخلص ہو وہ منزل تک نہیں پہنچے گا۔

حالاتِ حاضرہ

امریکہ کی سرپرستی میں اسرائیل کی کوشش ہے کہ فلسطینی مسلمانوں کی نسل کشی کے ذریعے ان کی قوت مزاحمت کو ختم کر دیا جائے اور باقی بچ رہنے والے مسلمانوں کو غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جائے۔ شیرون پر گریٹر اسرائیل کے قیام کا جنون سوار ہے' وجہ یہ ہے کہ امریکہ کی پشت پناہی کے باعث اسرائیل ایک بہت بڑی جنگی قوت بن چکا ہے لہٰذا عالم عرب کے تمام بڑے شہر اسرائیل نے اپنے ایٹمی میزائلوں کے نشانے پر رکھے ہوئے ہیں۔ اسرائیل کو عربوں یا عالم اسلام سے کوئی خوف پہلے تھا نہ اب ہے اور اب اس کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ وہ عالم کفر کی اپیلوں کو بھی مسترد کر کے فلسطینی مسلمانوں پر فوج کشی جاری رکھے ہوئے ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسرائیل خود عالمی جنگ شروع کرنے کا خواہاں ہے۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں اس آخری شوڈاؤن کا وقت بہت قریب ہے جس کی خبریں احادیث میں دی گئی ہیں۔ اگرچہ اس بڑی جنگ میں عربوں کو آزادی کے بعد دین اسلام قائم نہ کرنے اور اللہ کی بجائے واشنگٹن یا ماسکو کو اپنا قبلہ بنانے کی پاداش میں سزا کے طور پر بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا تاہم اس معرکۂ حق و باطل میں آخری فتح مسلمانوں اور اسلام ہی کو حاصل ہو گی۔ عربوں کے بعد دین اسلام سے غداری کے دوسرے مجرم ہم پاکستانی ہیں' جنہوں نے اسلام کے نام پر یہ ملک حاصل کیا اور اب تک یہاں

(باقی صفحہ 13 پر)

فلسطینیوں کا قتلِ عام اور عالمِ اسلام کی بے حسی

تجزیہ نگار کے نقطۂ نظر سے ادارہ کا کامل اتفاق ضروری نہیں

اسرائیلی فوجیں جدید ترین اسلحہ سے لیس ہوکر نہتے فلسطینیوں کو گھیرے ہوئے ہیں۔ ان کے ٹینک اور توپیں گولے برسا کر گھروں کو زمین بوس کر رہے ہیں۔ ایف ١٦ فضا سے آگ برسا رہے ہیں۔ میزائل مار کر بڑی بڑی عمارتوں کو تباہ و برباد کیا جا رہا ہے۔ عورتوں اور بچوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کئے جا رہے ہیں۔ شہید ہونے والے ٥٠٠ فلسطینیوں کو ایک اجتماعی قبر میں دفنا دیا گیا ہے۔ ظلم و ستم ہر ہر انداز میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ اس پس منظر میں ایک اسرائیلی فوجی افسر نے کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے کہ ہمیں یہ سب کچھ اس لئے کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ they are throwing rocks on us۔ اس میں اُس پتھراؤ کی طرف اشارہ ہے جو فلسطینی لڑکے اسرائیلی فوجیوں پر کرتے ہیں اور ان پتھروں کو چٹانیں قرار دیا گیا ہے۔ بہرحال' فلسطینی مسلمانوں کے خون سے زمین رنگین ہو رہی ہے جبکہ سلامتی کونسل محض قراردادیں پاس کر رہی ہے۔ ایک قرارداد میں اسرائیل سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ فوری طور پر جارحیت بند کرے اور فلسطینی علاقوں سے اپنی فوج واپس بلائے۔ امریکہ نے بھی اس قرارداد کی حمایت کی ہے اور خود صدر بش نے اسرائیل سے فوجیں واپس بلانے کا مطالبہ کیا ہے۔ امریکیوں کی منافقت اس سے ظاہر ہے کہ کولن پاول مشرق وسطیٰ کے دورے کے لئے امریکہ سے روانہ ہوتے ہوئے اس بات پر باقاعدہ خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کے پہنچنے تک اسرائیل اپنا کام پایہ تکمیل تک پہنچا چکا ہوگا۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تخریب کاری اور سازش یہود کے خمیر میں گندھی ہوئی ہیں۔ ان کی ذہانت اور فطانت کا تانا بانا شر اور مکر سے بُنا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی تیزی سے ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے ہیں۔ لیکن قریباً ہر صدی کے دوران دنیا میں کوئی نہ کوئی حاکم ایسا آتا ہے جو ان کے شر اور خباثت کا سختی سے نوٹس لیتا ہے اور انہیں عبرت ناک سزا دیتا ہے' جیسے گزشتہ صدی میں ہٹلر نے ان کا کچومر نکالا۔ لیکن عیاری اور مکاری اس قوم کے خون میں شامل ہو چکی ہیں۔ بلیک میلنگ اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے دوسروں کے کندھے استعمال کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لہٰذا یہ پھر وہی کچھ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

١٩١٧ء میں ''اعلانِ بالفور'' اسرائیلی ریاست کے قیام کی بنیاد بنا۔ یہ وہ دور تھا جب ساری دنیا جنگ عظیم اوّل کی لپیٹ میں تھی' خاص طور پر یورپ میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ عین جنگ کے دوران اس قسم کا اعلان یہودیوں کی بلیک میلنگ کا نتیجہ ہی ہو سکتا ہے۔ قصہ کوتاہ' ١٩٤٨ء میں یہ ناجائز ریاست قائم کر دی گئی۔ سوال یہ ہے کہ ہم اس ریاست کو ناجائز کیوں قرار دیتے ہیں!! کیا یہودی اللہ کی مخلوق نہیں اور کیا انہیں اپنے لئے ایک مملکت قائم کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے؟ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ

ابوالحسن

یقیناً یہودی بھی اللہ ہی کی پیدا کردہ مخلوق ہیں اور انہیں بھی تمام انسانی حقوق حاصل ہونے چاہئیں لیکن یہ کہاں کا قانون ہے کہ اس مقصد کے لئے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جائے جہاں ١٩٤٨ء کے اعداد و شمار کے مطابق آبادی میں مسلمانوں کی شرح ٨٧ فیصد تھی اور وہ اپنے آباء و اجداد کی اس سرزمین پر صدیوں سے آباد تھے۔ ٤٨٠ گاؤں ملیامیٹ کر کے فلسطینیوں کا قتل عام کیا گیا اور زندہ بچ جانے والوں کو وہاں سے بے دخل کر دیا گیا۔ بیگن نے دیریلیسین کے مردوں' عورتوں اور بچوں کو جس طرح قتل کیا' وہ ایک لرزہ خیز داستان ہے۔ ١٩٥٣ء میں قبیا کے لوگوں کا قتل عام کیا گیا۔ حد یہ ہے کہ موجودہ وزیر اعظم شیرون نے ١٩٨٢ء میں فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپوں میں ایک دن میں دو ہزار مسلمان قتل کر دیئے۔ یہودیوں کو دنیا بھر سے لا کر فلسطین کے علاقے میں بسایا گیا اور انہیں اسرائیلی شہریت دی گئی۔ ١٩٦٧ء میں فلسطین کا باقی ماندہ علاقہ یعنی دریائے اردن کا مغربی کنارہ اور غزہ کو ہڑپ کیا۔ صابرہ اور شتیلہ کے پناہ گزین کیمپوں میں قتل عام کی وجہ سے شیرون کو ''بیروت کا قصائی'' کہا جانے لگا لیکن اسرائیلی قوم کی اجتماعی ظالمانہ ذہنیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی ایسے خونی انسان کو اپنا حکمران منتخب کر لیا۔ بہرحال' یہودی ''گریٹر اسرائیل'' قائم کرنے کی راہ پر گامزن ہیں اور انہیں عیسائی دنیا خصوصاً امریکہ کی سرپرستی حاصل ہے۔ اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ مسلمانوں کا خون بے دریغ بہائیں گے لیکن افسوس' صد افسوس کہ عالم اسلام پر قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی ہے۔

مسلمان حکمرانوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر نے اپنے اپنے ملک میں اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے اور انہیں اپنے عوام کا اعتماد قطعاً حاصل نہیں۔ لہٰذا وہ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے اور اسے دوام بخشنے کے لئے اسی امریکہ سے مدد مانگتے ہیں جو اسرائیل کا پشت پناہ بن کر بالواسطہ طور پر مسلمانوں پر بدترین ظلم ڈھا رہا ہے۔ امریکہ اپنی مدد کی اجرت یوں وصول کرتا ہے کہ ان حکمرانوں سے عوام دشمن فیصلے کرواتا ہے۔ نتیجتاً عوام اپنے حکمرانوں سے متنفر ہو جاتے ہیں جو اپنے لوگوں کو جھوٹی تسلی دینے کے لئے کچھ نہ کچھ بیان بازی تو کرتے رہتے ہیں لیکن کوئی ایسا قدم اٹھانے کو تیار نہیں ہوتے جس سے امریکہ حقیقتاً ان سے ناراض ہو جائے۔ حالیہ بحران میں مصر' اردن' متحدہ عرب امارات نے فلسطینیوں کی مدد کے سلسلے میں زبانی ہمدردی کے سوا کچھ نہیں کیا۔ مصر نے یہ کہہ کر بڑا تیر مارا کہ وہ اسرائیل سے سفارتی روابط کے سوا تمام تعلقات منقطع کر لے گا' حالانکہ دو ممالک کے درمیان اصل تعلق سفارتی ہی ہوتا ہے اور اگر وہ قائم رہے تو باقی تعلقات منقطع کرنے کا دعویٰ کرنا آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔ اقتدار کے لالچ میں ایسی ہی غلطیاں یاسر عرفات سے بھی ہوئیں۔ انہیں امریکہ اور یورپ نے سبز باغ دکھا کر شیشہ میں اتار لیا اور وہ فلسطین کا صدر بننے کے شوق میں ایسا معاہدہ کر بیٹھے جو فلسطینیوں سے غداری کے مترادف تھا۔ پھر یاسر عرفات نے انتہائی مہلک اور سنگین غلطی یہ کی ہے کہ اسرائیل کے خاتمے کی شق ختم کر دی یعنی فلسطینیوں کی سرزمین پر اسرائیل کے قیام کو تسلیم کر لیا گیا۔ یوں دشمن کے مطالبات بڑھتے گئے' یہاں تک کہ یاسر عرفات نے حماس کے ساتھ امریکیوں کی ہدایات کے مطابق سلوک کرنا شروع کر دیا' جس سے باہمی نفرت اور دشمنی نے جنم لیا۔ عرب ممالک یہ

(باقی صفحہ 13 پر)

پیغامِ اقبال

محمد یونس جنجوعہ

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال انیسویں صدی کے آخری ربع میں شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اپنے دور کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور دنیا کے جدید ترین معاشروں کا خود اپنی آنکھوں کے ساتھ مشاہدہ کیا۔ وہ برطانیہ اور جرمنی میں رہے اور وہاں کی ترقی یافتہ تہذیب کا بغور مطالعہ کیا۔ سپین میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے آثار بھی دیکھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا کے اکثر ممالک کی طرح برصغیر بھی تاج برطانیہ کے ماتحت تھا۔ مسلمانوں کی یہ غلامی علامہ اقبال کو خون کے آنسو رلاتی تھی۔ اُن کی تمنا تھی کہ مسلمان خود مختار آزاد اور باوقار ہوں۔ چنانچہ انہوں نے مسلم اُمہ کی بیداری کے لئے اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ کا سہارا لیا۔ قدرت سے ذہن رسا اور موزوں طبیعت پائی تھی' پھر دل میں سوز و گداز اور آواز میں تاثیر تھی۔ قرآن کی عظمت اور رسول اللہ ﷺ کی محبت ان کا سرمایہ زندگی تھا۔ آپؐ کے قائم کئے ہوئے معاشرے کو وہ مثالی قرار دیتے تھے۔ دین و دنیا کی بھلائیوں کے لئے وہ اسلامی تعلیمات ہی کو حرف آخر سمجھتے تھے۔

علامہ اقبال حقیقت پسند تھے۔ انہیں امت مسلمہ کا درد رکھنے کی وجہ سے ''شاعر مشرق'' اور حقیقت شناس ہونے کی وجہ سے ''ترجمان حقیقت'' کے القابات دیئے گئے۔ ان کی شاعری بامقصد تھی۔ اس میں مصنوعیت اور بناوٹ ہرگز نہ تھی۔ جو ان کے دل میں ہوتا' وہی زبان پر لاتے۔ قرآنی تعلیمات پر اس قدر گہرا یقین رکھتے تھے کہ زندگی بھر فکرِ قرآن ہی کو پھیلایا اور اسی میں مسلمانوں کی فلاح' کامیابی اور ترقی سمجھی۔ اس طرح اگر ان کی شاعری کو الہامی سمجھا جائے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ انہوں نے اپنے اشعار میں وحی کے الفاظ ہی کی ترجمانی کی ہے۔ اپنی ایک فارسی نظم میں وہ برملا یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اشعار میں جو پیغام دیا ہے وہ سراسر قرآن کی تعلیمات ہیں۔ اس پر انہیں اس قدر وثوق ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر میں نے قرآن کے علاوہ کوئی بات کہی ہو تو قیامت کے دن مجھے رسول اللہ ﷺ کے بوسۂ قدم کی اجازت نہ دی جائے بلکہ مجھے ذلیل و رسوا کر دیا جائے۔ کون ہے جو اس قدر زوردار الفاظ میں اپنے حق میں بددعا کرے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس بات پر پورا یقین تھا کہ انہوں نے حق کے خلاف کوئی بات نہیں کہی۔

آپ نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو مسلمانوں کی حالت دیکھی جو انگریزوں کی غلامی اور ہندوؤں کی ماتحتی میں برے دن گزار رہے تھے۔ اس حقیقت کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے۔

غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

چنانچہ پستی میں ڈوبے ہوئے مسلمانوں کو وہ ماضی کی یاد دلاتے ہیں اور ان کی غیرت کو کچھ یوں جگاتے ہیں۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سر دارا
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا
تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا نے زمیں پر آسماں سے ہم کو دے مارا

پھر اقبال مسلم قوم کو امید کا پیغام دیتے ہیں کہ اگرچہ وہ گہرائی کی پستیوں میں گر چکی ہے مگر ہمت کر کے عزم و استقلال کے ساتھ وہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کی جدوجہد میں لگ جائے تو یہ چنداں مشکل نہیں۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

پھر کہتے ہیں:

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

عزم مصمم اور جہد مسلسل اگر خلوص کے ساتھ ہو تو اقبال کامیابی کو یقینی سمجھتے ہیں۔

کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا

امت کی اس بیداری میں وہ فکری قیادت بھی فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

علامہ اقبال خلوص نیت کے ساتھ جہد مسلسل کی تلقین کرتے ہیں تاکہ مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لیں۔ اس سلسلہ میں وہ پُر تاثیر الفاظ میں ہمت افزائی کرتے ہیں کہ اس راہ کی مشکلات سے ہرگز دل برداشتہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ ناکامیاں ہی کامیابی کا سنگ میل ہوتی ہیں۔

تندی باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے
نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں
آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

عقاب اور چیونٹی کے مکالمے میں چیونٹی کی پستی اور عقاب کی بلند پروازی میں ہمت کے عنصر کو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاک راہ میں
میں نُہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

اقبال پستی کے اس دور میں مسلم امہ کو بتاتا ہے کہ اگر وہ اپنا طرز عمل بدل کر تجدید ایمان کر لیں اور سیرت النبیؐ کی روشنی میں زندگی گزارنے کا عزم مصمم کر لیں تو اُن کے دن پھر جائیں گے اور وہ ناقابل تسخیر قوت بن جائیں گے کیونکہ اس صورت میں تائید ایزدی ان کے شامل حال ہو جائے گی۔ وہ کہتے ہیں۔

(باقی صفحہ 14 پر)

سالگرہ ۔۔۔ ایک جائزہ

ڈاکٹر زاہد الحق کی کتاب ''مغربی تہذیب کے رسم ورواج اور ہم'' سے لی گئی ایک تحریر

ضروری نہیں انگریز جو کام بھی کریں وہ عقل کی معراج کو ہی چھو رہا ہو۔ انگریز کی اکثر رسومات حماقت سے بھرپور ہوتی ہیں جن میں سالگرہ سرفہرست ہے۔ اسے انگریز کی طرف منسوب کرنے کا سب سے بڑا ثبوت انگریزی زبان کے وہ الفاظ ہیں جنہیں ادا کئے بغیر یہ تقریب مکمل نہیں ہو سکتی: Happy Birthday to You۔ کوئی بھی ''سالگرہ مبارک'' یا اس قسم کے دیگر الفاظ نہیں کہتا۔ ویسے بھی یہ وبا برصغیر میں انگریز کی آمد سے پہلے بالکل ناپید تھی۔

سالگرہ کا عقلی جائزہ

۱۔ سالگرہ ہمیشہ عمر کا سال ختم ہونے پر منائی جاتی ہے' نہ کہ سال کے شروع میں۔ یعنی اگر کسی کی تاریخ پیدائش یکم جنوری ہے تو وہ اپنی سالگرہ یکم جنوری ہی کو منائے گا' دو جنوری کو نہیں۔ ذرا سوچئے کہ عمر کا ایک سال کم ہو جانے پر خوشی منانا کون سی عقل مندی ہے!

۲۔ جس کی سالگرہ منائی جاتی ہے وہ اپنی عمر کے سالوں کی تعداد کے برابر موم بتیاں کیک پر روشن کرتا ہے اور پھر ان تمام موم بتیوں کو پھونک مار کر بجھا دیتا ہے جس پر تمام حاضرین تالیاں بجاتے ہیں۔

تالیاں صرف دو موقعوں پر بجائی جاتی ہیں۔ ایک خوشی کے موقعہ پر' دوسرے کسی کی حماقت پر اس کا مذاق اڑاتے ہوئے۔ اب اگر ایک شخص اپنی زندگی کے قیمتی سالوں کی شمعیں خود ہی پھونک مار کر بجھا رہا ہے تو یہ کوئی خوشی کا موقع نہیں ہے۔ اس لئے یہ تالیاں صرف اس شخص کی حماقت پر اس کا مذاق اڑانے کے لئے ہی بجائی جاتی ہیں۔ اپنی اس حماقت پر لوگوں کو بلوا کر تالیاں بجوانا کہاں کی عقل مندی ہے!

۳۔ سالگرہ پر زندگی کا ایک سال کم ہوتا ہے نہ کہ عمر ایک سال زیادہ ہوتی ہے۔

اسلام کی رو سے سالگرہ کا تصور

دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کی امت کو ایک عظیم مقصد کے لئے اس دنیا میں مبعوث کیا گیا ہے۔ دنیا کی مثال ایسی ہے کہ ایک بادشاہ چند لوگوں کو اپنے خزانے میں یہ کہہ کر داخل کرے کہ میں کسی بھی وقت تمہیں باہر نکال دوں گا۔ اس وقت جس کے پاس جو چیز ہو گی وہ اس کی ملکیت قرار دی جائے گی۔ اندر ایک طرف سونے چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں' دوسری طرف ہیرے جواہرات پڑے ہیں۔ کہیں اعلیٰ کھانے ہیں اور کہیں نرم نرم بستر ہیں۔ اب کچھ لوگ تو یہ سوچ کر کہ نہ جانے بادشاہ کب ہمیں باہر نکال دے' اس وقت کو غنیمت جان کر ہیرے جواہرات اکٹھے کر لیں گے جبکہ دوسرے گروہ نے سوچا کہ ابھی تو ہم آئے ہیں' ابھی تو کافی وقت ہے لہٰذا وہ کھانا کھا کر سو گئے اور کمائی کا قیمتی وقت کھانے اور سونے میں گزار دیا۔

اچانک بادشاہ نے سب کو باہر نکال دیا تو جو جواہرات وغیرہ لے کر آئے تھے ان کی بعد والی طویل زندگی آرام سے گزری اور جنہوں نے اپنے قیمتی وقت کو عیش وآرام میں گزار دیا تھا' وہ پچھتاتے رہے۔

اس دنیا کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے' کیونکہ یہاں پر رہ کر آخرت کی طویل اور لامحدود زندگی کے آرام کے لئے کمائی کرنی ہے۔ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے: ''جنت میں جانے کے بعد اہل جنت کو دنیا کی کسی چیز کا بھی قلق نہ ہو گا' بجز اس گھڑی کے جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر گزر گئی ہو۔'' وجہ صاف ظاہر ہے۔ جب اس دنیا میں جو دارالعمل ہے' ہر ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ کے پاک نام کا ذکر کرنے پر جو انعامات نظر آئیں گے تو یہ افسوس تو ہو گا ہی کہ اگر ہم دنیا میں وقت ضائع کئے بغیر مزید وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں گزارتے تو مزید انعامات کے حقدار ہوتے۔

جرجانیؒ سے حضرت سریؒ نے پوچھا کہ خشک ستو کیوں پھانک رہے ہیں۔ فرمایا کہ میں نے روٹی چبانے اور ستو پھانکنے کا حساب لگایا تو چبانے میں اتنا وقت زیادہ لگتا ہے کہ میں ستر مرتبہ سبحان اللہ کہہ سکتا ہوں۔ اس لئے میں نے چالیس برس سے روٹی کھانا چھوڑ رکھی ہے۔ اندازہ فرمائیں اتنے قیمتی وقت کے ختم ہونے پر سالگرہ منانی مناسب ہے! یہ دنیا مومن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومن کی جان مال کو جنت کے بدلہ میں خرید رکھا ہے' اب یہ زندگی اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔

اگر کسی کو یہ سودا منظور نہ ہو تو وہ دوسری بات ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: قیامت میں آدمی کے قدم اس وقت تک اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتے جب تک چار سوال نہ کر لئے جائیں:

۱۔ عمر کس مشغلہ میں ختم کی؟
۲۔ جوانی کس کام میں خرچ کی؟
۳۔ مال کس طرح کمایا اور کس کس مصرف میں خرچ کیا؟
۴۔ اپنے علم پر کیا عمل کیا تھا؟

جس شخص کو آخرت میں ان سوالوں کے جوابات دینے کی فکر ہو' وہ عمر کے قیمتی سال کم ہو جانے پر خوشی کس طرح منا سکتا ہے؟ اس کے علاوہ اسلام اسراف کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے غریب' مالداروں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے کیونکہ مالداروں کو اپنے مال کا حساب دیتے ہوئے دیر ہو جائے گی۔ سالگرہ پر خرچ ہونے سے نہ تو اسلام کا کوئی فائدہ ہوتا ہے نہ غریبوں کا بھلا۔

سالگرہ کا ایک بڑا مقصد نمود ونمائش ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں غریب میں احساس کمتری اور امیر میں احساس برتری بڑھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں شامل محفل راگ رنگ' ویڈیو فلم اور دیگر تصاویر بنانا شرعی طور پر بالکل حرام اور ناجائز ہیں۔ ان کے علیحدہ فتویٰ اور دلائل مستقل طور پر موجود ہیں' لیکن یہاں طوالت کے خوف سے نقل نہیں کئے جا رہے۔

بقیہ : مختصر تحریریں

رفیق کے لئے نقیب سے اپنا حال چھپانا ممکن نہ رہے۔ لیکن یہ ایک دشوار مرحلہ ہے' اس لئے کہ اکثر اسرہ جات اتنے وسیع علاقے پر محیط ہیں کہ رفقاء اور نقیب کے درمیان طویل فاصلوں کی خلیج حائل ہے' خصوصاً کراچی جیسے بڑے تجارتی شہر میں جہاں ہر شخص اتنا مصروف ہے کہ معاملات علیک سلیک سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ فاصلے اس لئے ہیں کہ رفقاء کی تعداد محدود ہے اور رفقاء کی تعداد اس لئے محدود ہے کہ دعوت کا کام اس نہج پر نہیں ہو رہا جو ضروری ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مرکز سے لے کر اسرہ کی سطح تک سب سے زیادہ زور دعوت اور وہ بھی انفرادی دعوت پر ہونا چاہئے کیونکہ عمومی دعوت تو بے شک درس قرآن کے ذریعے دی جا رہی ہے لیکن اس کے نتائج بھرپور اس لئے نہیں پیدا ہو رہے کہ انفرادی رابطے کم ہیں۔ دعوت کے کام کے لئے کوئی یکساں لائحہ عمل طے نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ رفقاء کی فہم وفراست پر مبنی ہے کہ وہ اپنے مخاطب تک اس کے مزاج اور ماحول کے مطابق کس طرح اپنی دعوت رکھ سکتے ہیں البتہ اس ضمن میں مرکزی ناظم تربیت نے جن دعوتی پروگراموں کا سلسلہ شروع کیا ہے ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ نظم چلانے کے لئے لزوم اور ترغیب وتشویق دونوں ضروری ہیں۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

۳۰ راپریل کو ہونے والے ریفرنڈم کا ذکر ''مجبوری کے جلسوں'' نے گلی گلی اور قریہ قریہ پہنچا دیا ہے۔ یہ راگ اچانک چھڑا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ بلند تر ہوتا چلا گیا اور اب ''ہم خیالوں'' سے آگے ''ہم مشرفوں'' سے ہوتا ہوا کچھ دوسروں کو اپنے جادو کے اثر سے ''ہم جولیوں'' میں کھڑا کر چکا ہے۔ اس کے باعث علامہ طاہر القادری اور غلام سرور قادری کے علاوہ عمران خان جیسے بھی اظہر میاں قوال اور ہمنواؤں کی ٹولی میں جھولی پھیلائے صف بستہ نظر آ رہے ہیں۔ کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا اٹھا کر بھان متی نے یہ کنبہ کیوں جوڑا؟

صدر پرویز کو گھوڑوں کی اس تجارت کی کیا ضرورت تھی؟ امریکہ کے ساتھ ''رات کے رابطے'' نے پہلے ہی رسوائی کا کم سامان کر رکھا تھا جو دن دیہاڑے ''سیاسی عصمت فروشوں'' کا پورا گروہ خرید کرنے کا باقاعدہ اشتہار دے دیا گیا؟ یہ ہے وہ اصل سوال جس کا کھوج لگانے کی ضرورت ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اکتوبر کے انتخابات سے قبل ایسا کرنا ضروری تھا تاکہ اسمبلی صدر کی پانچ سالہ ''خواہش صدارت'' کے لئے کوئی واقعی مسئلہ نہ کھڑا کر سکے۔ حالانکہ صدر کا اصل حلقہ انتخاب فوج ہے۔ جب تک ''براس'' ان کے ساتھ ہے' کسی بھاری مینڈیٹ والی طاقت کے لئے بھی یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ صدر کی اس خواہش کے آگے رکاوٹ بن سکے۔ اور جب یہ مہرے الٹے ہو جائیں تو تاریخ پاکستان کا فتویٰ یہ ہے کہ کسی مضبوط حکمران کی ''اڑان'' بھی کسی انہونی کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

چنانچہ ذرا گہری نظر رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ بین الاقوامی برادری کو مطمئن کرنے اور اپنے آپ کو ''منتخب صدر'' منوانے کے لئے ''بلیڈی سویلین'' کی ''عزت افزائی'' کی جا رہی ہے۔ لیکن جس انداز میں یہ مہم آگے بڑھائی جا رہی ہے' جبر اور زور کا جو مظاہرہ ہو رہا ہے' ریفرنڈم کا جو طریقہ کار وضع کیا گیا ہے اور اپنی واحد قابل قدر صفت یعنی ''کھرا اور سچا'' ہونے کو منافقت سے بدل دیا گیا ہے' کیا یہ سارے طریقے آزما کر بین الاقوامی برادری کو مطمئن کیا جا سکتا ہے؟ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا سکتی ہے؟ ظاہر ہے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دور میں یہ ممکن نظر نہیں آتا۔

دور کی کوڑی لانے والوں کا کہنا ہے کہ امریکہ اور صدر پرویز کا معاشقہ ختم ہو چکا ہے۔ پاکستان کی ایٹمی ٹیکنالوجی جو عطیہ خداوندی ہے اور اس سے قبل اکثر حکمرانوں کی جان اسی وجہ سے گئی ہے' صدر پرویز کے پاؤں کی بھی زنجیر بن گئی ہے۔ اس کے باعث امریکہ ناراض ہو گیا ہے اور متبادل مہرے کی جستجو میں ہے۔ چنانچہ اس ''سہارے'' کے چھوٹ جانے کے بعد صدر کو ''عوامی حمایت'' کے نئے سہارے کی ضرورت آن پڑی ہے اور یہ سارا کھکھیڑ اسی لئے مول لیا گیا ہے۔ لیکن کیا یہ سہارا ایسا ہے جو امریکہ کے مقابلے میں صدر صاحب کے کام آ سکے؟ صدر کے حمایتی اکثر و بیشتر یا بائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں

خالد محمود عباسی

یا ابن الوقت قسم کے لوگ ہیں جنہیں اپنے مفاد سے غرض ہوتی ہے یا وہ ہیں جو مشکل حالات سے بچاؤ کے لئے صدر کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ کیا ایسے لوگوں میں قربانی کا وہ مادہ ہو سکتا ہے جو امریکہ کے مقابلے میں صدر پرویز کو کھڑا رکھ سکے؟ اگر ان میں قربانی کا یہ مادہ ہوتا تو وہ پرویز مشرف کے ساتھ کیوں ہوتے؟ ظاہر ہے ہمارے ''حکیم'' صدر ایسے خام دلوں کے عنصر پر اپنی عمارت کی بنیاد نہیں رکھ سکتے۔ تو کیا صدر کا ریفرنڈم کا اقدام ہر علت اور ہر حکمت سے خالی ہے؟ نہیں! کسی حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یادش بخیر' صدر پرویز نے ۱۲ جنوری کو ایک تقریر کی تھی۔ بہت سی دیگر باتوں کے علاوہ انہوں نے فرمایا تھا کہ تین قسم کے معاملات فساد کا باعث بنتے ہیں:

(۱) پاکستان کے اندر مذہبی اختلاف رائے کے نتیجے میں ہونے والی فرقہ واریت جس کے خاتمے کے لئے انہوں نے چند جماعتوں پر پابندی عائد کی تھی۔

(۲) پاکستان کے اندر سیاسی مفادات کے باعث ہونے والا سیاسی ٹکراؤ جس کے لئے انہوں نے دینی سیاسی جماعتوں کو کوسنے کے ساتھ ساتھ نواز شریف اور بے نظیر کو پاکستانی سیاست سے بے دخل کرنے کا پروگرام ظاہر کیا۔

(۳) بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تنازعات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ ہم ساری دنیا کے مسلمانوں کے ٹھیکیدار نہیں ہیں۔

ریفرنڈم کا تعلق اس تیسری بات سے ہے۔ صدر پرویز کے اتنا کہہ دینے سے کہ ''ہم ٹھیکیدار نہیں ہیں'' پاکستانی مسلمانوں کا عالم اسلام سے ''خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر'' والا تعلق جو مسلمانان پاکستان کے لہو میں شامل ہے' ختم نہیں ہو جانا تھا۔ پھر اگر مسئلہ فلسطین اور بیت المقدس کا ہو تو یہ دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف عالمی صیہونی تحریک یہ طے کئے ہوئے ہے کہ مسئلہ فلسطین کا واحد حل یہ ہے کہ فلسطینیوں کی نسل کشی کی جائے۔ انہیں صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دینے کے منصوبہ پر عمل درآمد کا آغاز ہو چکا ہے۔ فلسطین کی گلیاں مسلمانوں کی لاشوں سے اٹی پڑی ہیں۔ دنیا بھر کی دکھلاوے کی اپیلوں کے باوجود یہ مہم پورے استقلال کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ ایسے میں پاکستان میں عوامی ردعمل کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ مسلمانان پاکستان کو اس ''ٹھیکیداری'' سے باز رکھنے کے لئے پوری صیہونی سکیم کو کیموفلاج کیا گیا ہے۔ ریفرنڈم نے پاکستانی میڈیا کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ فلسطین کی خبریں صفحہ اول پر جگہ نہ پا سکیں اور اداریوں' تجزیوں میں بھی ریفرنڈم ریفرنڈم ہو رہا ہے۔ فلسطین کا ذکر آٹے میں نمک کے برابر بھی مفقود ہے۔ نتیجتاً عوام کے لئے بھی اہم تر ایشو ریفرنڈم ہے نہ کہ فلسطین۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کیموفلاج سکیم بہت کامیاب جا رہی ہے۔ لیکن صیہونی سکیم جس جوش و خروش سے آگے بڑھ رہی ہے اسے کب تک کیموفلاج کیا جا سکے گا' یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ آنے والے جھٹکے اتنے شدید ہو سکتے ہیں جو محکوم کو خواب سے بیدار کرنے کا باعث بن جائیں۔ اس وقت حکمران اسے سلانے کے لئے ساحری کا کیا کرشمہ دکھائیں گے' یہ وقت آنے پر ہی معلوم ہو سکے گا۔

تاہم اگر صدر پرویز کو واقعی کسی سہارے کی ضرورت ہے تو انہیں چاہئے کہ وہ ہر طرف سے نظریں موڑ کر اللہ کے سہارے کو اختیار کر لیں۔ وہی سب سے مضبوط سہارا ہے۔ اسی سہارے میں عزت و وقار ہے اور اسی سہارے کو دوام حاصل ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

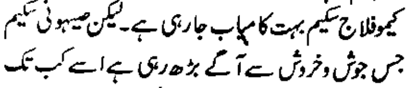

☆ امیر محترم کے معتمد ذاتی جناب سردار اعوان کے برادر بزرگ جناب رحمت خان قضائے الٰہی سے سرگودھا میں وفات پا گئے ہیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

وقت پر مبنی متبادل قرض

کے حوالے سے شیخ محمود کا تصور

تحریر: ڈاکٹر طاہر ابرار

آج سے تقریباً ایک دھائی قبل شیخ محمود مرحوم کی مختصر سی کتاب ''سود کی متبادل اساس'' اتفاقاً میری نظر سے گزری تو مجھے یہ احساس ہوا کہ بلاسود بنکاری کا نظام قائم کرنے کا اگر کوئی ذریعہ ہو سکتا ہے تو وہ صرف متبادل قرض یعنی Time Multiple Counter Loan(TMCL) کا نظریہ ہی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل قرض آپس میں مساوی قدر و قیمت کے حامل ہیں:

1000 روپے کا قرض ایک سال کی مدت کے لئے
500 روپے کا قرض دو سال کی مدت کے لئے
200 روپے کا قرض 5 سال کی مدت کے لئے
100 روپے کا قرض 10 سال کی مدت کے لئے
یعنی قرض کی رقم x مدت = قرض کی قدر و قیمت

اگر یہ بات صحیح ہے تو قرضوں کے لین دین کے لئے ایک اساس خود بخود مہیا ہو جاتی ہے۔ جو شخص بنک سے 1000 روپے ایک سال کی مدت کے لئے بلاسود قرض لینا چاہتا ہے وہ اسی وقت بنک کو 100 روپے متبادل بلاسود قرض کے طور پر فراہم کرے۔ اس طرح نہ کوئی سود لے گا' نہ دے گا۔

مغربی دنیا میں اس وقت کیپیٹل مارکیٹ کے پھول کر کپا ہو جانے کی وجہ سے کمرشل بنکنگ کے بجائے انوسٹمنٹ بنکنگ کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اس اعتبار سے TMCL بنکنگ جدید ترین رجحانات سے بھی ہم آہنگ ہے کیونکہ سرمائے کی کارکردگی پر سود کی وجہ سے جو ناروا بوجھ پڑتا ہے اس سے یہ تصور مکمل طور پر آزاد ہے۔ شیخ محمود مرحوم نے بنکنگ کا جو ماڈل تجویز کیا تھا اس کے مطابق ساڑھے بارہ فیصد متبادل قرض 8 سال کی مدت کے لئے حاصل کیا جائے گا۔ اس میں سے ڈھائی فیصد سٹیٹ بنک کے پاس ریزرو رکھا جائے گا' جس کا آٹھ گنا سٹیٹ بنک ضرورت پڑنے پر سیالیت (Liquidity) کے طور پر فراہم کرے گا۔ دو فیصد بنک میں Till Money کے طور پر رکھا جائے گا۔ متبادل قرض کی رقم میں سے باقی آٹھ فیصد براہ راست تعمیری سرمایہ کاری کے لئے استعمال کیا جائے گا۔

TMCL کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بہت محدود سطح پر قابل عمل ہے۔ اس دعوے کی بنیاد کیا ہے یہ کہیں نہیں بتایا گیا حالانکہ TMCL ایک سادہ فارمولا ہے جسے کسی بھی سطح کی بنکنگ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ' ہنڈیاں بھنانا' رہائشی مکانوں کی فراہمی' زرعی اور صنعتی قرضے' حکومتی قرضے' شخصی قرضے غرض کہ کون سی جگہ ہے جہاں اس نظریے کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا!

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ متبادل قرض چونکہ 8 یا 10 سال کی مدت کے لئے طلب کیا جا رہا ہے اس لئے اس کی واپسی کے وقت تک روپے کی ڈی ویلیوایشن کی وجہ سے متبادل قرض فراہم کنندہ کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ چونکہ TMCL نظام میں ڈی ویلیوایشن ختم ہو کر زیرو کی طرف آ رہی ہو گی لہٰذا عبوری مدت کے لئے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ روپے کو کسی مناسب معیار کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ سونے یا کسی مستحکم کرنسی کو قرض اور متبادل قرض کے لین دین میں معیار مان کر عبوری دور میں اس مشکل کو بآسانی حل کیا جا سکتا ہے۔

بنک کے مصارف کیونکر پورے ہوں گے؟

ساڑھے بارہ فیصد متبادل قرضے کی جو رقم اس کے لئے تجویز کی گئی ہے اس میں سے ڈھائی فیصد تو سٹیٹ بنک کے پاس چلی جائے گی اور دو فیصد Till money کے طور پر بنک میں رہے گی۔ باقی 8 فیصد جو 8 سال کے عرصے کے بعد واجب الادا ہوتی ہے' اس سے تعمیری سرمایہ کاری کر کے بنک خاطر خواہ منافع حاصل کر سکتا ہے۔

یہ بات کہ TMCL سسٹم میں بنک کی ذمہ داریاں یا واجبات بڑھتے جاتے ہیں' صحیح نہیں بلکہ مروجہ بنکنگ میں کل ڈیپازٹس اور ان پر ادا کیا جانے والا سود بھی بنک کے واجبات تصور ہوتے ہیں جبکہ TMCL میں چونکہ ڈیپازٹس پر کوئی سود ادا نہیں کیا جاتا اس لئے واجبات کا بوجھ سودی بنکنگ کے مقابلے میں نسبتاً کم ہو گا۔

لزوم سے ناگواری اور ترغیب وتشویق سے گریز

تحریر: محمد سمیع' کراچی

یہ آج سے کوئی تیرہ چودہ برس قبل کی بات ہے' جب میں نے تنظیم میں شمولیت اختیار کی تھی۔ اس وقت پورے کراچی میں ایک تنظیم ہوا کرتی تھی' جس کے اجتماعات عموماً شریف آباد میں واقع مسجد جامع الصفاء میں ہوا کرتے تھے یا پھر صدر میں واقع مسجد خضریٰ میں۔ اجتماعات میں شرکت کے دوران مجھے محسوس ہوا جیسے اجتماعات میں رفقاء کی شرکت لازم کے درجے میں نہیں۔ یہ بات میرے لئے بڑی الجھن کا باعث تھی لہٰذا میں نے اس وقت کے امیر شیخ جمیل الرحمٰن مرحوم (اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے) سے یہ سوال کیا کہ کیا رفقاء کے لئے اجتماعات میں شرکت لازم نہیں! جب انہوں نے نفی میں جواب دیا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا کہ حضرت یہ کیا بات ہوئی' اگر آپ اجتماعات میں رفقاء کی شرکت لازمی قرار نہیں دیں گے تو جس رفیق کا جب دل چاہے گا اجتماع میں شرکت کرے گا' جب اس کا دل نہ چاہے گا تو شرکت نہیں کرے گا۔ مرحوم کا جواب یہ تھا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے اجتماعات میں رفقاء کی شرکت کو لازم قرار نہیں دیا البتہ ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ہمارے رفقاء خود اپنے آپ پر اجتماعات میں شرکت کو لازم سمجھیں۔ اس وقت چونکہ میں تنظیم میں نووارد تھا لہٰذا میں نے اپنی بات پر اصرار نہیں کیا۔

یہ واقعہ مجھے اس وقت یاد آیا جب ماہ اپریل میں نائب امیر محترم حافظ عاکف سعید کے ساتھ تنظیم اسلامی کراچی وسطی (ا) کے رفقاء کی خصوصی نشست میں مقامی امیر جناب اظہر ریاض نے تنظیمی رپورٹ کی ترسیل کے لازم نہ ہونے کے حوالے سے نظم کے ذمہ داران کو پیش آمدہ دشواریوں کا تذکرہ کیا۔ دراصل نظم کو چلانے کے لئے کوئی بھی طریقہ ہمیشہ یکساں طور پر نہیں چلایا جا سکتا۔ حالات کے مطابق اس میں تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں۔ ایک زمانہ میں کراچی میں صرف ایک تنظیم تھی۔ پھر حلقہ سندھ قائم ہوا۔ بعد ازاں اس حلقہ کو بلوچستان تک توسیع دے دی گئی۔ اب اس پورے علاقے میں تین حلقے قائم ہیں۔ اس دوران اجتماعات میں شرکت اور رپورٹوں کی ترسیل لازم قرار دی گئی۔ اب جبکہ نظم کے ذمہ داروں نے یہ محسوس کیا کہ نظم کا ڈنڈا ہر معاملے میں نہیں گھمایا جانا چاہئے تو معاملات کو ترغیب وتشویق کے ذریعے چلانے کا فیصلہ کیا گیا ہے' جس کے نتیجے میں زیریں نظم کے ذمہ داروں کو مسائل درپیش ہیں جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کی کمزوریاں دوسروں کے سامنے عیاں نہ ہوں۔ یہی کمزوری رفقاء کی جانب سے رپورٹوں کی عدم ترسیل کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ ایک دوسری وجہ سستی بھی ہو سکتی ہے۔ بہرحال رپورٹوں کی ترسیل کا معاملہ ہمیشہ ایک مسئلہ رہا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پھر کیا کیا جائے؟ کیا رپورٹنگ سسٹم کی بساط ہی لپیٹ دی جائے؟ اس صورت میں یہ کیسے معلوم ہو گا کہ ہمارے رفقاء کہاں کھڑے ہیں؟ اس بارے میں دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ نقیب اپنے رفیق سے اس قدر بے تکلف ہو جائے کہ

(باقی صفحہ 8 پر)

کالے پانیوں کے نام

پہلی نظر میں لگا جیسے کسی ستم ظریف نے ہندو یوگیوں کی جماعت کو "مرغا" بنا دیا ہو! زرد رنگ کے ڈھیلے ڈھالے چغے، سر اور چہرے استروں سے منڈے ہوئے، آنکھیں، کان، ناک سب ڈھکے ہوئے، سر جھکائے اکڑوں بیٹھے ہوئے کئی ایک لوگ! الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ غور سے دیکھا تو اتنا کچھ نظر آیا کہ چاروں طبق روشن ہو گئے۔ چھوٹے چھوٹے آہنی ڈربے، چڑیا گھروں میں جنگلی جانوروں کے پنجروں سے بھی زیادہ مہیب۔ در و دیوار کی جگہ فولاد کی مضبوط زنجیریں۔ تند و تیز جھکڑوں اور طوفانوں کی زد میں ایسی ہی زنجیریں ان "زرد پوشوں" کے ہاتھوں کی زینت۔ عقدہ کھلا کہ افغانستان میں امریکہ کے ہاتھ لگنے والے قیدی ہیں جنہیں سب سے زیادہ خطرناک مجرم گردانتے ہوئے دنیا کے دوسرے کونے میں کیوبا کے ساحل سے ذرا ہٹ کر واقع گوانٹے ناما کیمپ پہنچایا گیا تھا۔ تمام انسانی حقوق سے محروم بے کس انسان جن کے بارے میں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ وہ کس دیس کے باسی ہیں، کن ماؤں نے انہیں جنم دیا تھا، کن فضاؤں میں پل کر جوان ہوئے تھے۔ ان جذبوں کی پرورش کہاں اور کیونکر ہوئی جو انہیں کشاں کشاں افغانستان لے گئے۔ کیا کوئی یقین سے کہہ سکتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے، کیا کیا خواب دیکھے ہوں گے انہوں نے جو ریزہ ریزہ ہو گئے! کیا واقعی ٹوٹے ہوئے شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں؟ ان میں سے ہر ایک کی ایک کہانی ہوگی جو غم و اندوہ کے ساتھ ساتھ رومانس سے مرتب ہوگی۔ ہر ایک کے لئے بارگاہ ایزدی میں ہاتھ اٹھتے ہوں گے، آنسو بہائے جاتے ہوں گے، کئی ایک کے فراق میں تڑپنے والے بھی ہوں گے جو ان کی خیریت کی خبر کو ترستے ہوں گے۔ کیا "ترقی یافتہ انسانی تہذیب" اتنا بھی نہیں کر سکتی کہ ان کے نام پتے ہی نشر کرا دے تا کہ ان کے غم خواروں کو یہ تسلی تو ہو کہ وہ سانس لے رہے ہیں۔ ہاں یہ زندگی تو نہیں، نام ہے مر مر کے جئے جانے کا۔

یہ کیمپ سمندر میں گھرا ہوا ہے، ہر طرف پانی ہی پانی۔ پا بجولاں گمنام قیدیوں کے دلوں میں بھی ایسا ہی سمندر موجزن ہوگا۔ یاس، ناامیدی، زندہ پکڑے جانے کا غم۔ ذہن اگر ماؤف نہیں کر دیئے گئے تو سوچتے ہوں گے کہ یہ ویرانی ہی ویرانی کیونکر ان کے مقدر میں لکھی گئی۔ نہ جانے کیوں مجھے کولرج کی مشہور نظم کے بول یاد آ رہے ہیں:

water water everywhere and not a drop to drink.

یعنی ہر طرف پانی ہی پانی ہے مگر پینے کو ایک بوند تک میسر نہیں۔ سمندر کی بخیلی کا رونا تو کتنے لوگوں نے رویا ہے، اس کی وسعتوں میں گھرا ہوا، جلتے سورج کی تمازت کا مارا بھٹکا ہوا راہی پیاس بجھانے کے لئے شبنم کو ترسے، شاید اس لئے سمندر کو کالا پانی کہا گیا۔ "خطرناک مجرموں" کو کالے پانی بھجوانے کی پرانی روایت بھی شاید اسی لئے پڑی کہ انہیں اپنوں سے بہت دور اجاڑ جزیروں کی نذر کر دیا جائے جہاں وہ گھل گھل کر مر جائیں۔ نپولین جب آخری بازی ہار گیا تو سینٹ ہیلینا کے جزیرے میں قید ہوا تھا۔ اس عظیم انسان کے آخری ایام کی روداد پر بے شمار آنکھیں آنسو برساتی رہی ہیں اور رہتی دنیا تک اشکبار ہوتی رہیں گی۔ انگریز پھر بھی کھلے ذہن والا فاتح اور حکمران تھا۔ رکھ رکھاؤ جانتا تھا، تہذیبی روایات کا پاس کرتا تھا۔ نہ صرف نپولین کو "مہذبانہ سہولتیں" بہم پہنچائی تھیں، کالے پانی کی سزا پانے والوں پر بھی زندگی اس قدر اجیرن نہیں تھی جتنی دور حاضر کے فاتحین نے کر رکھی ہے۔

جیون خان

عجیب اتفاق ہے کہ اس دنیا کو "جنت ارضی" بنانے کے خواب دیکھنے والوں کو اکثر کالے پانیوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے۔ جنوبی ایشیاء میں تو یہ کئی بار ہوا ہے۔ سید احمد شہید اور اسماعیل شہید بالاکوٹ میں اپنی جانوں کا نذرانہ دے چکے تو اس وقت کی مقتدر قوتوں نے سوچا کہ چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا ہے۔ انہیں خبر نہ تھی کہ شعلے ٹھنڈے پڑ گئے ہیں مگر راکھ میں دبی ابھی کئی چنگاریاں دعوت نظارہ کے لئے بے تاب تھیں۔ شیخ محمد اکرام "موج کوثر" میں لکھتے ہیں:

"یہ سلسلہ سارے ملک میں پھیلا ہوا تھا اور ہر جگہ سے حساس، مقتدین مسلمانوں سے خفیہ مدد تحریک کو مل رہی تھی۔ انگریزی حکومت نے نہ صرف مجاہدین کے خلاف فوجی اقدامات کئے بلکہ ملک بھر میں ان کے معاونین کے خلاف بھی مقدمے چلائے، ان کی جائیدادیں ضبط کیں اور دوسری سخت سزائیں دیں۔ یہ مقدمات بہ ترتیب سال حسب ذیل تھے:

1۔ انبالہ کا مقدمہ سازش 1864ء
2۔ پٹنہ کا پہلا مقدمہ سازش 1865ء
3۔ مالدہ کا مقدمہ سازش 1870ء
4۔ راج محل کا مقدمہ سازش 1870ء
5۔ پٹنہ کا دوسرا مقدمہ سازش 1871ء

جن لوگوں کو "عمر قید کالا پانی" کی سزا دی گئی ان میں مولانا یحییٰ علی، مولانا محمد جعفر اور مولانا عبدالرحیم سرفہرست تھے۔ ان کی جائیدادیں بھی ضبط کر لی گئی تھیں۔ 1865ء میں عین عید کے دن نہ صرف مکانات گرا دیئے گئے بلکہ انہیں ایک سوئی تک نہ لے جانے دی گئی۔

بہر ما بود آہ جرمے سخت
بردن سوز نے زجیلہ رخت

(سامان میں سے ایک سوئی لے جانا بھی ہمارے لئے بہت بڑا جرم تھا)"

شیخ محمد اکرام کے مطابق انہدام مکانات کی اطلاع جب مولانا محمد یحییٰ علی کو انڈیمان (کالے پانی) میں پہنچی تو اس وفا کے پتلے نے اپنی اہلیہ کو ایک بڑا لطیف اور محبت بھرا تسلی کا خط لکھا، ما حصل تھا:

"اللہ تعالیٰ کا شکر کرو کہ ہم ایسے امتحان کے لائق ٹھہرے"

جہاں سب کچھ لٹا کر بھی نہ صرف راضی برضا ہوں بلکہ لٹ جانے پر دل میں ذرہ بھر ملال نہ آنے پر پروردگار عالم کے حضور سجدۂ شکر بجا لایا جائے وہاں کے شب و روز تو نرالے ہی ہوں گے۔ وہ تو پروانوں کی دنیا ہوگی۔ شمع جلے گی تو پروانوں کا ہجوم عاشقاں تو ہر طرف سے کھنچا چلا آئے گا۔ یہ ریت تو بہت پرانی ہے۔ شوق شہادت کو کب اور کس نے پابند سلاسل کیا ہے؟ یہ جذبے تو ایسے ہیں کہ انہیں جتنا دبایا جائے اتنا ہی اور ابھرتے ہیں۔ کالے پانی راستے میں آئیں یا سولی پر لٹکا دیا جائے، عشق کا سیلاب بلا خیز کبھی تھمتا نہیں۔ یہاں بھی ایسا ہوا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ دیوبند سے تحریک اٹھی، مردہ رگوں میں خون دوڑنے لگا، دلوں کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں، عالم اسلام کی بے بسی خون کے آنسو رلانے لگی۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے رابطے شروع کئے۔ خلافت عثمانیہ ابھی نہ صرف قائم تھی بلکہ حجاز مقدس پر بھی ترکوں کی عملداری تھی۔ شیخ الہند حرمین شریفین کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے۔ ترک حکام سے ملاقاتیں کیں، گورنر کو ملنے کے لئے طائف کا سفر کیا۔ ابھی وہیں تھے کہ اتحادیوں خصوصاً انگریز کی شہ پر شریف مکہ نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ جنگ عظیم اول ختم ہونے کو تھی۔ عثمانیوں (ترکوں) کو ہر طرف شکست کا سامنا تھا۔ وہ نقصان پر نقصان اٹھا رہے تھے۔ حجاز مقدس میں بھی وہ پٹ گئے۔ اقبال نے ان پر وارد ہونے والے مصائب کے بارے میں ہی کہا تھا۔

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

(باقی صفحہ 13 پر)

نائب امیر تنظیم اسلامی جناب حافظ عاکف سعید کا دورۂ کراچی

امیر تنظیم اسلامی محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد کی علالت کی بناء پر ماہ اپریل میں نائب امیر جناب حافظ عاکف سعید ۶/تاریخ کو کراچی تشریف لائے۔ تنظیم کے دفتر میں ایک خصوصی نشست رکھی گئی تھی جس کا آغاز حلقہ کے امیر جناب محمد نسیم الدین کی گفتگو سے ہوا۔ انہوں نے پروگرام کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی۔ پھر جناب اظہر ریاض نے تنظیم کا تعارف پیش کیا۔ محترم جناب حافظ عاکف سعید نے سورۃ العصر کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا طریقہ بیان کیا۔ یہ وہ صراط مستقیم ہے جس کے سنگ ہائے میل ایمان، عمل صالح، تواصو بالحق اور تواصو بالصبر ہیں۔ انسان کی کامیابی کا دارومدار اس پر ہے کہ وہ نہایت ثابت قدمی کے ساتھ ان سنگ ہائے میل کو عبور کر لے۔ بعد نماز عشاء سوال وجواب کی نشست ہوئی۔

دوسری صبح ماہانہ دعوتی پروگرام کا آغاز جناب عامر خان کی گفتگو سے ہوا جس میں انہوں نے قرآن کریم کی مختلف آیات اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں "دین کے تقاضوں کا شعور حاصل ہونے کے بعد ان سے اعراض کی وجوہات" کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد جناب شجاع الدین شیخ نے "علائق دنیوی کی اصل حقیقت" کو سورۃ العبس اور سورۃ المعارج کی آیات اور احادیث نبویہ کی روشنی میں واضح کیا۔ جناب حافظ عاکف سعید نے سورۃ القمر پر درس دیتے ہوئے کہا کہ قرآن ایک کتاب ہدایت ہے لیکن ہم نے اسے صرف حصول وایصال ثواب کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ عربی زبان سے عدم واقفیت ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عربی زبان کی کم از کم اتنی تعلیم حاصل کر لی جائے کہ قرآن کی تلاوت کے دوران بغیر کسی ترجمہ کی مدد کے اس کے متن کا فہم حاصل ہو سکے۔ سورۃ القمر میں چار مقامات پر فرمایا گیا ہے کہ قرآن نصیحت حاصل کرنے کے اعتبار سے ایک سہل کتاب ہے، تاہم اس میں موجود حکمت کے موتیوں کو برآمد کرنے اور ان سے فقہی مسائل کے استنباط کے لئے عربی زبان پر عبور ضروری ہے۔ اس سورہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کی ہلاکتوں کا تذکرہ فرمایا ہے جن تک رسولوں کی دعوت پہنچی لیکن انہوں نے اس دعوت کو رد کر دیا۔ اس سے ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہئے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ سرکشی کے رویئے کو ترک کر کے اس کی کامل بندگی کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ آخر میں انہوں نے حاضرین کے مختلف سوالات کے جوابات بھی دیئے۔ نماز ظہر کے بعد رفقاء نے مرکزی مجلس مشاورت میں حلقہ کی نمائندگی کرنے والے افراد کے انتخاب میں حصہ لیا، جس کے دوسرے مرحلے میں جناب حافظ عاکف سعید بھی موجود تھے۔ حلقہ کے ناظم نے انتخاب کے مختلف مراحل کی نگرانی کی۔ (رپورٹ: محمد سمیع)

فلسطینی مسلمانوں پر اسرائیلی مظالم کے خلاف
تنظیم اسلامی لاہور کا احتجاجی جلسہ ومظاہرہ

تنظیم اسلامی لاہور کے زیر اہتمام اسرائیلی مظالم کے خلاف احتجاجی جلسہ بعنوان "فلسطینیوں کا قتل عام اور مسلم ممالک کی بے حسی۔ ایک لمحہ فکریہ!" اتوار ۱۴/اپریل پریس کلب لاہور میں منعقد ہوا جس کی صدارت جناب عبدالرزاق ناظم اعلیٰ تحریک خلافت پاکستان نے کی۔ جلسہ کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ تلاوت کی سعادت حافظ محمد عرفان نے حاصل کی۔ پروگرام کے سٹیج سیکرٹری جناب نعیم اختر عدنان نے جلسہ کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے پیرس کی ساربون یونیورسٹی کے یہودی پروفیسر کی رائے جو ۹/اگست ۱۹۶۷ء کو یروشلم پوسٹ میں چھپی تھی حاضرین محفل کو پڑھ کر سنائی۔ یہ رپورٹ یہودیوں کی مسلمانوں کے خلاف دشمنی کا منہ بولتا ثبوت ہے:

"بین الاقوامی یہودی تحریک کو کسی طرح بھی پاکستان کے بارے میں غلط فہمی کا شکار نہیں رہنا چاہئے۔ پاکستان ہمارا اصلی اور نظریاتی جواب ہے۔ پاکستان کا ذہنی وفکری سرمایہ اور عسکری قوت آگے چل کر اسرائیل کے لئے کسی بھی وقت پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔ ہمیں اس کا حل بھی سوچنا چاہئے۔ ہندوستان سے اسرائیل کی دوستی نہ صرف ضروری ہے بلکہ ہمیں اس تاریخی دشمنی سے فائدہ اٹھانا چاہئے جو کہ ہندو برصغیر کے مسلمانوں بالخصوص پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں کے خلاف رکھتا ہے۔ ہندوؤں کا برصغیر کے مسلمانوں سے تاریخی عناد یہودیوں کا بہترین سرمایہ ہے"۔

پروگرام کے پہلے مقرر تنظیم اسلامی لاہور کے امیر مرزا ایوب بیگ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہودیوں نے ہمیشہ وقت کی قوتوں کو بلیک میل کیا ہے۔ اس وقت امریکہ مسلمانوں کے قتل عام پر اسرائیل کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ وہ فلسطین میں جاری مظالم کے ذریعے مسلمانوں کو مشتعل کر رہے ہیں تاکہ جنگ کی صورت میں وہ "عظیم تر اسرائیل" قائم کر سکیں۔ انہوں نے کہا کہ امن کبھی بھیک مانگنے سے نہیں ملتا، اگر مسلمان امن چاہتے ہیں تو جنگ کے لئے تیار رہیں۔ یہودیوں کے مظالم دراصل پاکستان کے خلاف جنگ کا آغاز ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب تک ہم خود اپنے آپ اور قوم سے مخلص نہیں ہوں گے اس وقت تک مسلمان ذلت کا شکار ہوتے رہیں گے۔

نعیم اختر عدنان علامہ اقبال کے اشعار کے ذریعے جلسے کے سامعین کا خون گرماتے رہے۔

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش تیرے وجود میں ہے

تیری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے

اور

ہے خاک فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا

جلسہ کے دوسرے مقرر جماعت اسلامی کے نائب امیر جناب جسٹس (ر) شیخ خضر حیات نے کہا کہ مستقبل اسلام کا ہے اس لئے پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی جاری ہے۔ فلسطین مسلمانوں کی سرزمین ہے اور یہودی کسی اعتبار سے اس پر حق نہیں رکھتے۔ مسلمانوں کے قتل عام پر پوری دنیا کا ضمیر مردہ ہے، ہمیں احتجاج کے ذریعے ان کے ضمیر کو جھنجھوڑنا چاہئے۔

جمعیت علمائے اسلام کے راہنما مولانا امجد خان نے کہا کہ اسرائیل سرعام دہشت گردی کر رہا ہے اور دہشت گردی کے خلاف آپریشن کرنے والے ممالک اس کا نوٹس نہیں لے رہے۔ انہوں نے کہا کہ پوری دنیا کے مسلمان حکمران امریکہ کے تابع ہو چکے ہیں۔ وہ واشنگٹن سے این او سی لئے بغیر کوئی اقدام نہیں کرتے۔ جب تک مسلمان جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر ایک پرچم تلے نہیں آئیں گے، کامیاب نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے کہا کہ اقوام متحدہ کے فیصلے مسلمانوں کے حق میں نہیں ہو سکتے۔ مسلمانوں کو اپنے فیصلے خود کرنا چاہئیں۔

جناب عبدالرزاق ناظم اعلیٰ تحریک خلافت پاکستان نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ دنیا کو اسلام کے زندہ دین ہونے کا خوف لاحق ہے جس کی وجہ سے نام نہاد مہذب اقوام مسلمانوں کی نسل کشی کر رہی ہیں۔

جلسہ کے بعد تنظیم اسلامی کے سینکڑوں رفقاء نے بھرپور اور منظم احتجاجی مظاہرہ کیا۔ شرکاء نے بینرز اور پلے کارڈ اٹھا رکھے تھے جن پر درج ذیل عبارات درج تھیں:

☆ دہشت گردی کے خاتمہ کیلئے اسرائیل کا خاتمہ ضروری ہے۔
☆ مہذب دنیا کے دشمن، امریکہ اور اسرائیل
☆ بیت المقدس پر یہودیوں کا قبضہ عالم اسلام کے لئے باعث شرم ہے۔
☆ فلسطینیوں کے قاتل شیرون اور بش
☆ ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔
☆ To eliminate terrorism eliminate Israel

(رپورٹ: وسیم احمد)

بھارت میں مسلمانوں کی نسل کشی کے خلاف حلقہ سندھ (زیریں) کا مظاہرہ

پاکستان کے قیام کے اول روز سے ہندوستانی مسلمان ہندوؤں کے مظالم کا شکار ہیں، جن کی سنگینی گجرات میں حالیہ مسلم کش فسادات کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ اگرچہ ہم اتنی قوت نہیں رکھتے کہ ان مظالم کو بزور روک سکیں تاہم نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کے مطابق ان کے خلاف آواز تو بلند کر

سکتے ہیں۔ لہٰذا تنظیم اسلامی حلقہ سندھ (زیریں) کی جانب سے ۲۲ مارچ کو کراچی پریس کلب کے سامنے ایک احتجاجی مظاہرہ حلقہ کے امیر جناب محمد نسیم الدین کی قیادت میں منعقد کیا گیا۔ اگرچہ یہ چھٹی کا دن نہ تھا تاہم رفقاء کی ایک بڑی تعداد اس مظاہرے میں موجود تھی۔ رفقاء بینرز اور پلے کارڈز اٹھائے ہوئے تھے جن پر مختلف عبارات درج تھیں۔ اس موقع پر ایک بیان میں امیر حلقہ نے کہا کہ دنیا بھر میں خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہا ہے اس کا علاج پاکستان کو ایک مضبوط اسلامی ریاست بنا کر ہی کیا جا سکتا ہے اور اس کے لئے ہمیں انفرادی اور اجتماعی سطح پر اللہ کی بندگی اختیار کرنی پڑے گی۔ تقریباً ایک گھنٹے تک فضا میں فلک شگاف نعرے گونجتے رہے۔ پریس فوٹوگرافرز مظاہرے کی تصویریں اتارتے رہے۔ اگلی صبح مختلف اخبارات میں اس مظاہرے کے بارے میں خبریں شائع ہوئیں۔ مظاہرے کے اختتام پر جناب انجینئر نوید احمد نے دعا کروائی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہماری نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی کو قبول فرمائے اور بھارت سمیت دنیا کے تمام مسلمانوں کو مظالم سے نجات دلائے! (رپورٹ: محمد سمیع)

بقیہ : افکارمعاصر

ترک شیخ الہند کے خوابوں کی تو کیا آبیاری کرتے' شریف مکہ نے انگریز کے حکم سے انہیں گرفتار کروا کر پہلے جدہ اور پھر مصر بھجوا دیا۔ حسین احمد مدنی صاحب جوان دنوں مدینہ شریف میں مقیم تھے' از خود شیخ الہند سے آن ملے تھے اور ان کے ساتھ رہنے پر مصر تھے۔ دونوں پر مصر میں مقدمہ چلا اور قید کی سزا پائی۔ قید کاٹنے کے لئے انہیں مالٹا بھجوا دیا گیا۔ عشاق کا یہ قافلہ ''اسیرانِ مالٹا'' کہلایا۔ ایک چھوٹا سا جزیرہ اور اس کے اردگرد ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔

قید کٹ چکی تو یہ حضرات وطن لوٹے۔ شیخ الہند کی رحلت کے بعد مولانا حسین احمد مدنی جامع دیوبند کے سربراہ ہوئے۔ عالم اسلام کی بیداری کے لئے تڑپ بدستور قائم رہی۔ علماء کی کھیپ تیار ہوتی رہی۔ فارغ التحصیل طلبہ ہر طرف پھیلتے رہے۔ اتفاق سمجھئے یا سید احمد شہید اور اسماعیل شہید کے قدموں کی برکت کہ خاصی بڑی تعداد میں ''علماء'' نے سرحدی علاقوں میں مدارس قائم کئے۔ طالبان کی قیادت کا ان مدارس سے گہرا تعلق تھا۔ افغان جہاد میں شریک غیر افغان مجاہدین کی اکثریت نے بھی طالبان کا ساتھ دیا۔ لگتا تھا کہ سید احمد شہید کا خواب پورا ہونے کو ہے مگر قدرت کو ابھی اور امتحاں مقصود تھے۔ القاعدہ دریافت ہوا' ۱۱ ستمبر اس کے ماتھے لگا۔ طالبان حالات کی نئی کروٹوں کو نہ بھانپ سکے اور افغانیوں پر کوہ غم ٹوٹ پڑا۔ کچھ ''اسیران بلا'' پھر کالے پانیوں کو چلے' دیکھیں کہ حقیقت منتظر کب لباسِ مجاز میں نظر آتی ہے!

(بشکریہ روزنامہ جنگ ۱۷ مارچ ۲۰۰۲ء)

بقیہ : تجزیہ

جانتے ہوئے بھی کہ فلسطینیوں کا قتل عام امریکہ کی آشیرباد سے ہو رہا ہے' اس سے سفارتی و تجارتی تعلقات منقطع کر لینا تو دور کی بات اسے تیل کی سپلائی بند کر دینے پر بھی تیار نہیں حالانکہ یہ ہتھیار استعمال کر کے وہ امریکہ کے ہوش ٹھکانے لگا سکتے ہیں۔ لیکن آگے بڑھ کر قدم اٹھانے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ اقتدار کا لالچ ان کے پاؤں کی بیڑیاں بن چکا ہے۔

پاکستان کا معاملہ بھی دوسرے اسلامی ممالک سے مختلف نہیں۔ یہاں کے حکمران بھی اسرائیل کے سرپرست یعنی امریکہ کی رضا کو اپنے اقتدار کے لئے لازمی سمجھتے ہیں' حالانکہ بعض یہودی مفکروں اور سیاست دانوں کے حوالہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آ چکی ہے کہ پاکستان ان کی نگاہ میں بری طرح کھٹکتا ہے اور وہ ایک عرصے سے اس کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ اس کا واضح ثبوت بھارت کے ساتھ ہر سطح پر ان کا تعاون ہے۔ ایک اسرائیلی دانشور کا قول ہے کہ پاکستان ہمارا اصلی اور نظریاتی مخالف ہے' اس لئے اسرائیل کے قیام اور بقا کے لئے لازم ہے کہ اس کے نظریاتی دشمن کو ختم کر دیا جائے۔ سابق اسرائیلی وزیراعظم بن گوریان نے ۷۰۔۱۹۶۹ء میں علی الاعلان کہا تھا کہ ہمیں عربوں سے کوئی خطرہ نہیں' وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے بلکہ ہمارا اصل دشمن پاکستان ہے اور اسرائیل کے مفاد کا تقاضا ہے کہ پاکستان کو ختم کیا جائے۔ اس وقت تک پاکستان ایٹمی قوت بھی نہیں بنا تھا۔ ایٹمی قوت بننے کے بعد اور موجودہ حالات سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اسرائیل فلسطینیوں کو ٹھکانے لگانے اور عربوں کو خوفزدہ کرنے کے بعد پاکستان کی طرف بڑھے گا۔ ظاہر ہے وہ پاکستان سے براہ راست معاملہ کرنے کے بجائے بھارت کے ذریعے سے نمٹے گا۔ لہٰذا ایک طرف پاکستان کی سرحدوں پر بھارتی فوج کیل کانٹے سے لیس کھڑی ہے' دوسری طرف امریکہ اپنے ایٹمی ٹینکز کے ساتھ پاکستان کی سمندری سرحدوں پر تیار کھڑا ہے تاکہ اس کی ایٹمی صلاحیت کو قبل از وقت ہی ناکارہ بنا دیا جائے جبکہ تیسری طرف اسرائیل عربوں کو مکمل طور پر کچل کر مسلمانوں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ یہود کا سازشی ذہن مکمل منصوبہ بندی کر چکا ہے' —— ہے کوئی جو عالم اسلام کو جھنجھوڑے' کہیں ایسا نہ ہو کہ خواب خرگوش ابدی نیند میں ہی بدل جائے!

تنظیم اسلامی کا پیغام
نظام خلافت کا قیام

بقیہ : منبرومحراب

اسلامی نظام قائم کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔

صدر پرویز مشرف کے بارے میں اگرچہ یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ پاکستان سے مخلص ہیں اور پاکستان کی خوشحالی اور استحکام کے دل سے خواہاں ہیں لیکن اس کے لئے وہ ''چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی'' کے اصول کے مطابق ملک کو دو ٹوک انداز میں عریاں سیکولرازم کی راہ پر گامزن رکھنے کا عزم مصمم کئے ہوئے ہیں۔ شاید انہیں یہ معلوم نہیں کہ ''اسلام'' کو پاکستان کی بنیاد اور اساس ہی کی نہیں' واحد وجہ جواز کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ بالفرض اگر سیکولر پاکستان مستحکم اور خوشحال ہو جائے تو بھی یہ اپنا جداگانہ وجود برقرار نہیں رکھ سکے گا اور بھارت میں مدغم ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ منطقی بات ہے کہ اگر پاکستان میں بھی وہی سیکولر نظام ہو جو بھارت میں ہے' تو علیحدہ ملک کے قیام کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ موجودہ حکومت کی یہ روش پاکستان کے وجود اور مستقبل کے اعتبار سے انتہائی خطرناک ہے۔ صدر مشرف کو اس معاملے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حالیہ ریفرنڈم آئین کی خلاف ورزی کے مترادف ہے' انہیں چاہئے کہ اعلیٰ عدالتوں سے رجوع کریں۔ تاہم صدر مشرف کے ارادوں اور تیاریوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ریفرنڈم ضرور کرائیں گے۔ لہٰذا مخالفت سے یہ ملتوی ہوتا نظر نہیں آتا جبکہ بائیکاٹ سے الٹا نقصان ہو گا۔ اس ضمن میں دینی طبقات کے لئے درست طرز عمل شاید یہ ہو گا کہ ریفرنڈم میں پوچھے گئے سوال کے نفی والے ووٹ زیادہ سے زیادہ کاسٹ کرائے جائیں تاکہ معلوم ہو کہ کتنے فی صد لوگ حکومت کی پالیسیوں کے تسلسل کے خلاف ہیں۔ اگرچہ جس طرح سرکاری مشینری کے بل پر مینار پاکستان کا جلسہ ہوا ہے یہ ریفرنڈم بھی ایسا ہی ہو گا' تاہم جنرل ضیاء کے ریفرنڈم کی طرح یہ بودا اور محض خانہ پری کا ریفرنڈم نہیں ہو گا' کیونکہ جنرل ضیاء کے سوال کے مقابلے میں جنرل مشرف کا سوال کافی واضح ہے۔ اسی طرح جنرل ضیاء نے اپنی ریفرنڈم مہم کے لئے عوامی جلسے نہیں کرائے تھے۔ لہٰذا محسوس ہوتا ہے کہ اس بار ریفرنڈم کے موقع پر کافی گہما گہمی ہو گی۔ تاہم اگر کوئی ووٹ ڈالنے نہ بھی آیا تو گمان غالب ہے کہ بعد میں فرشتے ووٹ ڈال جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ صدر مشرف نے کہہ دیا ہے کہ اگر میں نے ہارنا ہوتا تو ریفرنڈم منعقد ہی کیوں کراتا۔

موجودہ حالات میں دینی جماعتوں کا فرض ہے کہ وہ خالص دینی جماعتوں کا محاذ قائم کریں اور اپنا ایک اسلامی منشور تیار کر کے حکومت کے سامنے اس پر عمل کرنے کا مطالبہ رکھیں اور مل جل کر حکومت پر دباؤ ڈالیں۔ لیکن افسوس بظاہر ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔

Economist magazine still stood: "A useless dictator."

The September 11 so-labelled "terror attacks" — gradually exposing to be the product of US-Israel conspiracy — turned the tables on the Western love for democracy in Pakistan. And less than six months later, the General has became the toast of the West — the most favoured dictator. His talk of referendum, his inflated rhetoric of "either you are with the reformer or else", is the sign of full American support, which will in the long run, do the Pakistanis and Americans little good. Any model developed out of expediency by a regime, believing in might is right, is bound to fail regardless of the time required to put it in place.

Instead of dancing to the false tunes, we need to end both the democratic and dictatorial illusions by challenging the status quo, disrupting the existing military and political contours of power and opening the way for renewal. Let us have a look at the third dimension. The last but realistic hope needs to be pinned on exploring our *Deen* (note its difference from religion), which can play a vital role in developing a viable governing model. Realisation of this hope needs ordinary people who find the will to engage themselves with their surrounding reality and to question the conflict between what they are told and what they see and experience. Francis Fukuyama considers liberal democracy "the end of history," but we need to begin from where they have declared an end to their journey.

The current gloom among Pakistanis is not simply a consequence of the special problems confronting Pakistan; it also feeds upon the difficulties and uncertainties afflicting other sham and so-called established democracies in the West on the one hand and double standards of the West in imposing political and military tyrants on weaker states on the other. Moreover, democratic systems seem to have outlived their utility, because even the Western countries are increasingly confronting many similar challenges, ranging from the required submission to the arrogant capitals to the weakness of political parties and corruption.

The idea of one-person-one-vote, that brings down a person of Allama Iqbal's calibre to the level of a common man, has failed less because of its inherit flaws and more because of the unreliable voting process in which, for instance, less than 23 percent Americans elected Bill Clinton to be the most powerful man in the world. In Pakistan, we are in a better position to tell the world of finding no difference between democracy and dictatorship – both have no political equality for all citizens and both lack multiple mechanisms for accountability of rulers to the ruled.

Free democratic elections are not a guarantee to a responsive, good government. Democracy and dictatorships would remain indistinguishable as long as feudal elites and military Generals rule behind the facade of democratic elections and opposition forces are persecuted. Elected governments are no guarantee to serving the nation under the principles of an ideal democracy, which is defined with the abundant use of the word people.

One of the greatest dangers to democracy's future is the blithe assumption of its champions that it will continue for want of any coherent ideological alternative. The idea of neutralising Islam is a direct product of the fear of an ideological alternative to the prevailing democratic tradition rising to power. If democracy is widely seen as malfunctioning, decadent, corrupt, inept, abusive, contemptuous of the real concerns of ordinary citizens, and a tool of Western hegemony, very soon would there be an end to the much vaunted democratic revolution. These are the classic conditions for democratic breakdown, and a new wave of Islamic movements must be considered a real possibility in the coming years.

The need is to constructively and collectively consult Islam as a *Deen* regardless of our political, military or any other background. Let us not ask the dim-witted question of "which Islam," because we never bothered to ask, which democracy – the Egyptian autocratic democracy; the Turkish Garrison democracy; the Algerian blood-sucking democracy; or the American two party dictatorship. Amos Perlmutter, writing in IHT on January 21, 1992, declared, "Islam and democracy simply aren't compatible." Let us admit it. But instead of throwing Islam out, let us find a solution to our un-ending problems in Islam. Undoubtedly, it is very difficult, but let us debate and chalk out ways to go about it. Let us not crush Islamic movements in the name of militancy and extremism. Lets help them reach a conclusion and consensus on the core issues for governing Muslim countries according to the principles of Islam.

بقیہ : پیغامِ اقبال

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل

اس کی ادا دلفریب اس کی نگاہ دل نواز
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

پھر اقبال کہتے ہیں ۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

علامہ اقبال سچے اور مخلص مسلمان تھے۔ وہ مومن زندہ رہنا چاہتے تھے اور مومن ہی مرنا چاہتے تھے۔ گوشہ نشینی ان کے نزدیک گناہ تھی۔ وہ حرکت میں زندگی اور جمود میں موت کے قائل تھے۔ انسان کو شاہکار تخلیق سمجھتے تھے اور حیاتِ انسانی کو بامقصد۔ اس زندہ انسان کو وہ زمین پر بوجھ سمجھتے تھے جو جانوروں کی طرح محض آرام و آسائش اور کھانے پینے سے دلچسپی رکھتا ہو' جس کا کوئی بلند ارادہ اور اعلیٰ نصب العین نہ ہو۔ زمین و آسمان اور تمام کائنات کو انسان کی خاطر پیدا کیا گیا اور انسان کو نیابت حق کے لئے۔ اگر اگر انسان یہ حق ادا نہیں کرتا تو وہ انتہائی ناشکرا ہے کیونکہ اس طرح وہ نہ تو وہ اشرف المخلوق کہلانے کا حق دار ہے اور نہ عزت و شرف اس کا مقدر۔ وہ امت مسلمہ کو اتحاد' یقین اور جہد مسلسل کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ۔

یقین محکم' عمل پیہم ' محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

meaningful step to end Israeli occupation, as they did in the case of Kuwait, the teenage girl along with hundreds of other Palestinians would have been alive and well today. Nevertheless, there is no denying the fact that the totalitarians would face the same kind of resistance anywhere they go because our liberal and secular mind makes us see the validity of Qur'an only when we are personally oppressed. The woman who bombed herself to kill American soldiers in Kabul, is a glaring example of this attitude.

Thomas Friedman declared in his *NY Times* column (March 31) that the Palestinians have a "tactical alternative to suicide: non-violent resistance, á la Gandhi" to overcome their desperation." It is amazing that Mr. Friedman didn't give this advice to Kuwaitis, or the Americans after September 11 or to the Israeli occupiers after the suicide bombing. He believes the Palestinians "have not chosen suicide bombing out of 'desperation'," they "have adopted it as a strategic choice."

Why didn't the Kuwaitis adopt suicide bombing as a strategic choice? Because they knew the American have become more Kuwaitis than the Kuwaitis. Why don't the Americans adopt this strategic choice? Because they know they can drop bombs from 40,000 feet, kill others and stay safe. The US is unleashing terror without any desperation. Imagine the extent of American response if they were dying in as many number as the Palestinians on a daily basis for more than 35 years and had no other weapon than their limbs.

Islam or the "narcissistic rage" did not blind the Palestinians. The super humanists have betrayed them. There can *never* be peace in the Middle East and in the world as long as people like Friedman are sitting in the *New York Times* and the *Washington Post* offices, personifying Islam and labelling Muslims as "Devil." Mr. Friedman writes: "The Devil is dancing in the Middle East, and he's dancing our way." Giving the Muslims a lecture on the sacredness of human life doesn't suite Mr. Friedman who can't see Israel bulldozing the basic truth civilization is built on: the same sacredness of every human life. The American pundits' unflinching support to the Israeli occupation and wishing death to Islam shows that the Devil is already in their minds.

Instead of wishing death to Islam, we hope the West would follow its noble tradition of drawing line in the sand for Sharon, put an economic embargo on Israel for its "naked aggression," occupation and amassing -- and using its weapons of mass destruction against innocent civilians, call Israel to withdraw immediately or get ready to face a coalition of 32 countries for throwing it out of the occupied Arab lands. Sounds crazy? Must be! At least, to the hypocrites, following multiple standards for the basic truths.

Let's Stop Dogging Reality

Abid Ullah Jan

General Musharraf is right in his criticism of the political leaders. So are the political leaders in their condemnation of the General for bulldozing almost everything that hinder his dreams to rule *ad infinitum*. Both the General and politicians are correct in denouncing religious parties for not showing any ability to govern the country under an agreed model of Islamic state. The helpless public is right in its understanding of the fact that democracy and dictatorship are irrelevant to the US, its Allies and leading capitalist institutions as long as their interests are served. Who then is wrong and where is the problem?

How can we make our debate more meaningful, when we know our discussions on referendum or elections are useless because we have to put up with what the General dreams? Since we are perplexed in the present, let's try to answer the questions beginning at the end. What would we be left with after the General when the systems erected out of expediency would be hurled down out of expediency? We can hardly deny that at the end of his 8-10 year rule — provided he doesn't resort to one-candidate shame elections, like Hosnie Mubarak — we would face a far greater mess than we faced in August 1988 after the plane crash in Bahawalpur.

We have come to the hard part of our saga. So far, hopes were attached to repeated elections and military takeovers, which allowed the public to dodge serious questions of hierarchy and class and race, the inequalities of poverty and plenty, the privileges embedded in the political and bureaucratic order, and above all sustainability of a good governing system. But we can no more hope that another plane crash or a new martial law will make the things any better than before. This may be the moment of testing that history was preparing for us all along.

Fifty-five years is a lifetime. If both democracy and dictatorship have failed to give us a viable governing system, what then is the right system? Due to our bitter experience some of us prefer dictatorship and a majority still seem to trust democracy more than Plato did. For Plato, democracy — both in states and in individuals — is something that descends directly into tyranny. A tyrant will stop at nothing to satisfy his passions. There is no bond he will not betray, no custom he will not violate (The Republic, 565e). Imagine the extent of tyranny when a dictator becomes a democrat and democracy becomes a tool to perpetuate dictatorship.

The value of democracy in the eyes of its champions is before our eyes. Two years ago, the General had to suffer the humiliation of Bill Clinton wagging his finger at him — a public dressing down of a Third World dictator, unusual even for an American president. Just seven months ago, he was a pariah military dictator who had overthrown the elected government. He was unwelcome in most foreign capitals. After one year in power, the *Washington Post* considered him "Just a Dictator," hardly "any better at running the country than his elected predecessors" (editorial Oct. 17, 2000). After two years, the damning judgment of *The*

Vol:11 Regd.CPL No:127 No:15

Weekly Nida-e-Khilafat Lahore

View Point

Abid Ullah Jan
(E-mail: abidjan@tanzeem.org)

Wishing Death To Islam

The chilling theme of the leading American newspapers in the first week of April revolved around the problem with Islam. *Washington Post's* editorial, "Islam's death wish" (April 5) was preceded by *New York Times* editorial "The Cancer of Suicide Bombing" (April 03) and followed by a series of articles from "Why Suicide Terrorism Takes Root," to "Kids with Bombs," and "Suicidal Lies." In a well orchestrated hate campaign, Islam is presented as an individual who wishes death and destruction. The reality, however, is that the world mastering demi-gods, recently energized by the impotency of the Muslims, are wishing death to Islam.

What really hurts the leading opinion makers in the US is the recent resolution passed by the Muslim states, which specifically rejected the idea of equating Palestinian resistance with terrorism. *Washington Post* writes the word resistance in quotation marks, because unlike Saddam's incursion into Kuwait, it doesn't view Israel's occupation illegitimate. In such a situation, is it extremism to doubt impartiality of such opinion makers?

Such blatant rejection of Israel's occupation and terrorism is, in fact, prolonging the conflict. It is senseless to brush aside 50 year's of Israeli repression, begin discussion with a story of suicide bombing, and then turn around to hold Islam responsible for the ongoing bloodbath in the Middle East.

Israel and the US are not out there to combat terrorism; they are there to combat resistance to their totalitarian designs. According to the *Post*, the Muslim countries' approval to resist any external domination is "self-destructive and morally repugnant." To the same great minds of the editorial board, the Israeli and American terror campaigns, which lead to such resistance, are fully justified and morally acceptable.

There is no "extremist Islamic ideology" which the *Post* wants the Muslims to renounce; nor is the Palestinian cause a "terrorist cause." There is no need for the Muslim media to incite anti-Semitism. The news from Israel is sufficient to help everyone make an opinion. The reason the Muslim governments are not ready to label Palestinian resistance as terrorism is that they not only see Israelis dying in a pizza parlour or a discotheque, but also the Palestinians throughout the occupied Arab land for the last fifty-five years. If it is "shameful evidence of their [the Muslims] own moral and political corruption," so is justifying Israel's occupation shameful evidence of the double standards employed by the leading American papers.

The *Post* wants us to believe that the Palestinian resistance has damaged the peace process and cost them American favours. Why should ending Israeli occupation require a 12-year long process of negotiations, when Iraqis were repeatedly told that there would be "no negotiations" until they withdraw from Kuwait? If Bush Senior could draw a "line in the sand" for Saddam, why can't Bush Junior draw a line for Sharon? If Judaism is not responsible for Israel's terrorism, why shall Islam be blamed for the Palestinian resistance?

The *New York Times*' editorial "The Cancer of Suicide Bombing" is a clear sign of Israel and its supporters' weariness with the suicide bombing. There is hardly anything else that makes Israel pay the price of its occupation. Hence, Israeli supporters need Muslims from around the world to distance themselves from the weapon that hurts Israel dearly. It is easy for other Muslims, sitting on the sidelines, to decide any way they may like, but the final decision is for the Palestinians to make between getting killed by the Israelis or get killed while killing the Israelis.

It is hard for the *New York Times* to accept the reality of Palestinian desperation under the Israeli occupation, than to easily denounce an 18-year-old Palestinian girl, who blew herself up in a Jerusalem supermarket. Is anyone living a free and happy life even imagine to die such a horrible death? Why can't the *New York Times* feel the pain of the suicide bomber when it editorialises the pain of Israelis?

Definitely, Islam is against repression and clearly instructs its followers: "**Allah does not like that the evil should be uttered in public except by him who has been wronged." (4:148). "And those who, when an oppressive wrong is done to them, take revenge." 42:39). "And indeed whosoever takes revenge after he has suffered wrong, for such there is no way [of blame] against them. The way [of blame] is only against those who oppress men and rebel in the earth without justification; for such there will be a painful torment." (42:41-42).**

However, those who have tried to associate suicide bombing to religious doctrines have been proved wrong. These and other *jihad* related verses from the Holy Qur'an are equally applicable to all the Muslims. Why don't we go to commit suicide for the Palestinians?

Shibley Telhami, while writing in the *New York Times* (April 04) admits the fact that Islam has no major role in the suicide bombing because "from nonreligious young women to members of the semi-Marxist Popular Front for the Liberation of Palestine to the secular Al Aksa Martyrs Brigades, groups and individuals have begun emulating the suicides of Hamas." The reason is simple: they didn't see anyone coming to their rescue so far.

The teenage girl "suicide bomber" left a taped message speaking of "sleeping Arab armies" and impotent Muslim governments. Had anyone, the Muslims, the UN, the US or its super-humanist allies taken a